قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ —— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی. گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ —— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون : ۸۷۹۲۴۶

فہرست مضامین

لمعات	ادارہ	۲
اسلام میں توسیعِ فکر کی اہمیت	علامہ غلام احمد پرویز	۵
قائدِ اعظم	صفدر سلیمی	۱۷
حضرت مسیح کی انقلاب آفریں تعلیم	ادارہ	۲۳
مُفت کی جنّت	آصف جلیل	۳۰
اخبارات کے اسلامی صفحات	علی محمد چدھڑ	۳۵
قرآنِ کریم کی روشنی میں زندگی	ثریا عندلیب	۴۱
ابلیس کون ہے؟	مرزا افضل حسین	۴۴
ملاوٹ	ڈاکٹر سید عبدالودود	۵۱
سُپر پاور	ملک حنیف وجدانی	۵۸
باب المراسلات	ادارہ	۶۰
عذابِ الٰہی	حسین امیر فرہاد	۶۳
اعلاناتِ درس	ادارہ	۶۷
بچّوں کے صفحات	ادارہ	۷۰
UNDERSTANDING ISLAM	by. Dr. Syed Abdul Wadud)	۷۶
RANDOM REFLECTIONS	by SHAKIR RIZWANI	۸۰

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون : ثریا عندلیب

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ناشر : عطاء الرحمٰن آرائیں

طابع : سید عبدالسلیم

مطبع : آفتاب عالم پریس

۱۳۔ ہسپتال روڈ۔ لاہور

فون ۔ ۳۲۷۳۹۲

مقامِ اشاعت : ۲۵/بی. گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

جلد ۴۵ — دسمبر ۱۹۹۲ء — شمارہ ۱۲

بدل اشتراک

سالانہ

پاکستان —— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک —— ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ : ۔/۱۰ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

شناختی کارڈ میں آئیڈیالوجی کا اندراج

شناختی کارڈ میں "آئیڈیالوجی" کا اندراج ہمارے نزدیک اہم ترین ضرورت ہے جسے روزِ اوّل ہی سے اپنا لیا جانا چاہیئے تھا۔ پھر بھی دیر آید درست آید کے مصداق اس پر جتنی جلدی عمل کر لیا جائے اتنا ہی مناسب ہوگا۔ تاہم شناختی کارڈ میں لفظ "مذہب" کا اضافہ جہاں غیر مسلموں کے لئے شکوک و شبہات کا باعث بن رہا ہے وہاں عام مسلمانوں کے لئے بھی کم تشویشناک نہیں، کیونکہ اس قوم میں جو پہلے ہی لسانی، سیاسی اور علاقائی گروہ بندیوں کا شکار ہے، اگر کوئی قدر مشترک باقی ہے تو وہ ان کا "مسلمان" ہونا ہے۔ شناختی کارڈ میں خانہ "مذہب" کا ہوگا تو اس کے سامنے صرف "مسلمان" لکھنا کسے راس آئیگا اور آج جب کہ مذہبی پیشوائیت اپنے لاؤ لشکر سمیت میدانِ سیاست میں کود پڑی ہے۔ وہ کیوں اپنے متبعین کو مذہب کے خانے میں سنّی، شیعہ، حنفی، اہل حدیث، دیوبندی، بریلوی، اثنا عشری، اسماعیلی، قادری، سہروردی، چشتی یا نقشبندی لکھوانے کا حکم نہ دے گی اور اس طرح ملک میں موجود گروہ بندیوں کو کم کرنے کی بجائے یہ قوم مذہبی، مسلکی، گروہی، فروعی، فقہی اور مشربی بنیادوں پر مزید ۷۲ ٹکڑوں میں بٹ جائے گی۔ لہٰذا ہماری رائے میں شناختی کارڈ کے اس خانے میں (جو ضرور ہونا چاہیئے) مذہب کی جگہ "قوم" لکھا جانا چاہیئے اور اس کے سامنے انتخاب "مسلم" اور "غیر مسلم" کے الفاظ تک محدود رہنا چاہیئے کہ دو قومی نظریہ جس کی بنیاد پر پاکستان وجود میں آیا اور قائم ہے کا یہی تقاضا ہے۔ رہے غیر مسلم تو پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو جو بحیثیت پاکستان کے معزز شہری اور ان تمام شہری حقوق و مراعات کے حق دار ہیں جو کسی بھی مہذب ملک میں کسی اقلیت کو حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ اسلام کے تصورِ زندگی میں انسانوں کی تقسیم اور قومیت کی تشکیل آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اسلام ایک مخصوص اور منفرد آئیڈیالوجی پیش کرتا ہے جو ذہنِ انسانی کی وضع کردہ نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لئے وحی کی رُو سے ملی ہے۔ یہ آئیڈیالوجی قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ دنیا کا جو انسان اس آئیڈیالوجی

کی صداقت کو تسلیم کرتا ہے وہ اسلامی برادری (قومیت) کا فرد قرار پاتا ہے۔ جو اس سے اختلاف کرتا ہے وہ دوسری قوم کا رکن ہوتا ہے۔ چونکہ اسلامی ہیئتِ اجتماعیہ کی پوری عمارت اس آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ اس لئے اسلامی قومیت کا تصورِ حیات، اندازِ نگاہ، خارجی حوادث کے خلاف ردِّ عمل، غیر اسلامی قومیت سے مختلف متمیز اور منفرد ہوتا ہے۔ ان دونوں کا ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا تو ایک طرف، ان میں نہ مفاہمت ہو سکتی ہے نہ مداہنت۔ اس کے برعکس، مغربی نیشنلزم (قومیت) کا تصور یہ ہے کہ کسی ایک خطہ میں بسنے والے انسان بلا تمیز مذہب، ایک قوم کے افراد ہوتے ہیں۔ ان کا تمدن، نہجِ زندگی، زاویۂ نگاہ اور طرزِ فکر و عمل ایک ہوتا ہے۔ مذہب کی تفریق، اعتقادات اور عبادات تک محدود ہوتی ہے جن کا انسان کی اجتماعی زندگی سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ قومیت کا یہ تصور اسلام کی اصل و بنیاد کے یکسر خلاف ہے۔

پاکستان کے غیر مسلم شہریوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ دو قومی نظریہ نہ صرف اسلام کا اساسی اصول ہے، بلکہ مملکتِ پاکستان کی بنیاد بھی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اسی اصول کی رو سے مسلمانانِ ہند کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا تصور دیا اور قائدِ اعظمؒ مسلسل دس سال تک اسی کے لئے جنگ لڑتے رہے اور بالآخر اسے انگریز اور ہندوؤں دونوں سے منوا کر چھوڑا اور یوں یہ مملکت وجود میں آئی۔ ہر چند کہ پاکستان کو قائدِ اعظمؒ کی میراث کہا جاتا ہے لیکن دیکھا جائے تو قائدِ اعظمؒ کی اصل میراث دو قومی نظریہ ہے جس نے پاکستان کو جنم دیا۔

دو قومی نظریہ پہلے بھی ہمارے دشمنوں کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا آج بھی ان کے لئے سوہانِ روح بنا ہوا ہے۔ جوں جوں پاکستانی قوم اس نظریے کی معنویت سے غافل ہوتی جائے گی ہمارے دشمنوں کا وہ خواب پورا ہوتا جائے گا جو انہوں نے اکھنڈ بھارت کی شکل میں دیکھا تھا۔ لہٰذا یہ بات روزِ اوّل ہی طے ہو جانی چاہیئے تھی کہ کون لوگ قرآن کے اندر محفوظ وحیٔ خداوندی کے مطابق بطور "مسلمان" زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اور کون قرآن کے پیش کردہ دین سے ہٹ کر کوئی دوسرا طرزِ زندگی اپنانا چاہتے ہیں تاکہ ان کے لئے ان کی مذہبی ضروریات کے مطابق الگ سے اہتمام کر دیا جائے جو حکومتِ پاکستان کی اہم ترین ذمہ داریوں میں سے ہے۔ قومی شناختی کارڈ میں اپنی آئیڈیالوجی کا اظہار نہ کرنے کے دو ہی مطلب سمجھ میں آتے ہیں۔ اوّل یہ کہ ایسے افراد اپنی آئیڈیالوجی (مذہب) سے مخلص نہیں اور دوم یہ کہ یہ لوگ بھیس بدل کر "دو قومی نظریے" کو جو پاکستان کی بنیاد ہے کمزور کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اب جبکہ یہ سوال پیدا ہوا ہے تو قائدینِ ملت اور حکومتِ وقت کو یہ اصول ہمیشہ کے لئے طے کر لینا چاہیئے کہ پاکستان میں بسنے والا ہر شہری حتمی طور پر اعلان کرے کہ وہ "مسلم" ہے یا "غیر مسلم" اور یہی اس کی پہچان ہو۔ اور اس اصول کو شناختی کارڈ تک ہی محدود نہ رکھا جائے بلکہ آئندہ مردم شماری بھی اس بنیاد پر ہو تاکہ نظامِ اسلام کے قیام اور غیر مسلموں کے حقوق کے تحفظ کے لئے صحیح منصوبہ بندی کی جا سکے۔

قارئینِ محترم

سلام و رحمت

دسمبر ۱۹۹۲ء کا شمارہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے ساتھ ہی بہت سے قارئین کا زرِ شرکت برائے سال ۱۹۹۲ء ختم ہو گیا ہے۔ ایسے کرم فرماؤں سے درخواست ہے کہ وہ آئندہ سال کے لئے زرِ شرکت جلد ارسال فرمادیں تاکہ پرچے کی ترسیل منقطع نہ ہو۔

زرِ شرکت حسبِ سابق

_____ اندرونِ ملک _____ ۱۲۰/- روپے

اور _____ بیرونِ ملک _____ ۴۰۰/- روپے سالانہ

_____ (یا اس کے مساوی زرِ مبادلہ) _____

پرچہ بذریعہ وی پی ہدایات ملنے پر ہی ارسال کیا جائے گا۔ اگر کسی وجہ سے پرچہ جاری رکھنا مقصود نہ ہو تو بھی اطلاع ضرور فرمادیں تاکہ یاددہانی کی ضرورت نہ رہے۔

◆

پیشگی کھاتوں سے جاری پرچوں کی تجدید خود بخود ہو جائیگی۔ ہاں البتہ اگر کسی قسم کی کوئی ترمیم مقصود ہو تو اس کی اطلاع ۲۵ دسمبر سے قبل فرمادیں۔ بزم ہائے طلوعِ اسلام خاص طور پر توجہ فرمائیں۔

ناظم ادارہ
طلوعِ اسلام لاہور

علامہ غلام احمد پرویزؒ

علامہ غلام احمد پرویزؒ کا یہ مضمون ہم ماہنامہ 'جہانِ نو' کے خصوصی نمبر سے بصد شکریہ نقل کر رہے ہیں۔
ایڈیٹر

اسلام میں توسیعِ فکر کی اہمیت

میرے اس مقالہ کا مجوّزہ موضوع "اسلام میں توسیعِ فکر کی اہمیت" ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جب تک یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ اسلام میں غور و فکر کا کیا مقام ہے، اس کی توسیع کی اہمیت کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ لہٰذا میں پہلے فکر کی اہمیت کے سوال کو لیتا ہوں اور جو کچھ میں اس ضمن میں پیش کروں گا اس کی سند قرآنِ مجید ہوگی۔ یہی میرا زندگی بھر کا معمول ہے۔

فکر کا ماحصل علم ہوتا ہے اور اسلام میں علم کی اہمیت کا اندازہ قرآنِ مجید کے ان چند الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ:۔

"اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ کیا اہلِ علم اور بے علم کبھی ایک جیسے ہو سکتے ہیں؟ لیکن یہ حقیقت بھی ان ہی لوگوں کی سمجھ میں آ سکے گی، جو عقل و فکر سے کام لیں۔"

اس سے علم کی اہمیت ہمارے سامنے آ گئی۔ اس کے بعد قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ انسانی علم کی کوئی حد نہیں یعنی کوئی انسان، کسی زمانے میں بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ علم کی انتہا تک پہنچ گیا ہے۔ اس عظیم حقیقت کی وضاحت کے لئے قرآنِ مجید میں کہا گیا ہے کہ (اور تو اور) وہ گرامی قدر ہستی (یعنی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) جو علم کی معراجِ کبریٰ پر فائز تھی وہ بھی یہ دعا کیا کرتے تھے کہ:۔

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (۲۰/۱۱۴) "اے میرے نشوونما دینے والے! میرے علم میں اضافہ فرما دے۔"

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآنِ مجید کی رُو سے علم کا مفہوم کیا ہے؟ یعنی وہ علم کہتا کسے ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ علم کوئی ظنّی، قیاسی یا باطنی قسم کی شے نہیں۔ انسانی حواس خارجی کائنات سے جو معلومات حاصل کرتے ہیں ان پر غور و فکر کے بعد انسان جس نتیجے پر پہنچتا ہے اسے علم کہا جاتا ہے، اس قسم کے فکری نتائج

میں باہمی ربط یا ہم آہنگی سے کلیات مرتب ہوتے ہیں' بالفاظِ دیگر (SENSE OF PERCEPTION) سے (CONCEPTS) مرتب کرنے کا نام علم انسانی ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے۔

"جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو' علم سے مراد یہ ہے کہ تم اپنی سماعت اور بصارت (حواس) کے ذریعے معلومات حاصل کر کے کامل غور و فکر کے بعد کسی نتیجے پر پہنچو۔ یاد رکھو! اس بات میں تم پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اس طرح علم حاصل کر لیا تھا یا یوں ہی کسی بات کے پیچھے لگ گئے تھے۔

اہلِ علم ابھی تک حتمی طور پر متعین نہیں کر سکے کہ انسانی فکر کا مرکز کیا ہے؟ کبھی کہا گیا کہ فکر نظامِ دماغ (BRAIN) ہے' کبھی اسے (HEART) کہہ کر پکارا گیا۔ پھر اس کے بعد (MIND) کا لفظ وضع کیا گیا لیکن اس کا بھی کوئی حتمی مفہوم متعین نہیں کیا جا سکا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اصطلاح بھی اب فرسودہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کے لئے دو الفاظ استعمال کئے ہیں۔ قلب اور فواد ان دونوں میں کیا فرق ہے اس کی تشریح کا یہ مقام نہیں)۔ اس وقت بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ قرآنِ مجید نے کہا ہے کہ اپنے حواس کے ذریعے معلومات حاصل کرو اور پھر انہیں اپنے قلب یا فواد کے سامنے پیش کرو تاکہ وہ اُن پر غور و فکر کے بعد کسی نتیجے پر پہنچ سکو' یہ ہے حصولِ علم کا فکری طریق۔ قرآنِ مجید نے اس فکری طریق کو اس قدر اہمیت دی ہے۔ اس کے لئے بے شمار آیات پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہاں چند ایک پر اکتفا کروں گا۔ سورۃ الاعراف میں ہے:۔

"اکثر لوگوں کی کیفیت یہ ہے۔ خواہ وہ متمدن اقوام کے افراد ہوں اور خواہ جاہل بادیہ نشین۔ کہ ان کی روشِ زندگی پکار پکار کر کہہ رہی ہوتی ہے کہ یہ جہنمی ہیں۔ یہ وہ ہیں جو سننے میں دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ ان کی آنکھیں بھی ہوتی ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن وہ ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ انسان نہیں حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے (اس لئے کہ حیوان کم از کم اپنی جبلّت کے مطابق تو چلتے ہیں اور اس قسم کے انسان ان حدود کی طرف سے بھی) آنکھیں بند کئے رکھتے ہیں۔"

یعنی قرآنِ مجید کی رُو سے جو عقل و فکر سے کام نہیں لیتے وہ اہلِ جہنم ہیں۔ اسی لئے دوسرے مقام پر کہا گیا کہ جب مجرمین کو جہنم کی طرف لایا جائے گا تو اس کا داروغہ اس سے پوچھے گا کہ کیا تمہیں کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ سلامتی کی راہ کونسی ہے اور تباہی کا راستہ کون سا؟ وہ کہیں گے کہ یہ کچھ بتانے والے تو آئے تھے لیکن ہم نے نہ بجوشِ ہوش ان کی بات سنی نہ اس پر غور و فکر کیا۔

"اگر ہم ان کی بات سُن لیتے اور عقل و فکر سے کام لیتے تو ہمارا شمار اہل جہنم کے زمرے میں کیوں ہوتا؟" ۳

آیت (۷/۱۷۹) میں غور و فکر سے کام نہ لینے والوں کو حیوان بلکہ ان سے بھی بدتر قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ انفال میں جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ:۔

"دیکھنا! تم کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم نے پیغاماتِ خداوندی کو تو سُن لیا ہے لیکن وہ انہیں دل کے کانوں سے نہیں سنتے۔"

یاد رکھو!

"قانونِ خداوندی کی رُو سے بدترین خلائق وہ لوگ ہیں جو بہرے اور گونگے بنے رہتے ہیں اور عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔"

اسی لئے وہ کہتا ہے:۔

"اُن سے کہو کہ (مجھے بتاؤ) کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتے ہیں؟"

سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگ ایسی کھلی ہوئی حقیقت پر غور و فکر کیوں نہیں کرتے؟ ان کے برعکس جماعتِ مومنین کے متعلق کہتا ہے کہ:۔

"حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں ان کے لئے تخلیق کائنات اور گردش لیل و نہار میں قوانینِ خداوندی کی محکمیت اور ہمہ گیری کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں"۔

یعنی اربابِ فکر و نظر کے لئے۔

"جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے، بیٹھے، لیٹے قانونِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور تخلیق کائنات پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور اپنی تحقیق کے بعد علیٰ وجہ البصیرت پکار اُٹھتے ہیں کہ ہمارے نشو و نما دینے والے تونے اس کارگہِ ہستی کو نہ تو عبث اور بے کار پیدا کیا ہے اور نہ تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لئے' یہ بات تجھ سے بہت بعید ہے کہ تو کسی شے کو بے مقصد اور بلا غرض و غایت یا تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا کر دے (یہ ہماری کم علمی اور کوتاہ نگہی ہے کہ ہم تحقیق سے کام نہیں لیتے اور اس طرح اشیائے کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہ کر عذاب کی زندگی بسر کرتے ہیں)۔ تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم علمی تحقیقات اور تجربات کے بعد کائناتی قوتوں سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں اور اسی طرح تباہی اور بربادی سے محفوظ رہیں۔"

اسلام کے خلاف اعتراض کرنے والے اکثر کہتے ہیں کہ یہاں تک تو ٹھیک ہے کہ قرآنِ مجید نظامِ فطرت پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور کارگہِ کائنات سے متعلق مشاہدات اور تجربات کی تلقین کرتا ہے لیکن "مذہب کی دنیا"

میں وہ عقل و فکر کی صلاحیتوں کو سلب کر دیتا ہے، علم و بصیرت کے چراغ گُل کر دیتا ہے اور کہتا یہ ہے کہ جو کچھ تم سے کہا جائے اسے آنکھیں بند کر کے مان لو۔ اسی کا نام ایمان ہے۔ ایمان اور فکر دو متضاد چیزیں ہیں جو یک جا نہیں ہو سکتیں۔

اصل یہ ہے کہ ان معترضین نے عیسائیت کو دیکھا اور اسی سے اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ مذہب میں عقل کو دخل نہیں ہوتا۔ عیسائیت میں فی الواقعہ ایسا ہوتا ہے۔ لیکن ان معترضین کی غلط فہمی یہ ہے کہ انہوں نے عیسائیت کے مطالعہ سے اخذ کردہ نتائج کو بلا دیکھے بھالے اسلام پر چسپاں کر دیا اور ایسا کرنے سے پہلے قرآن مجید کے ورق پلٹنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی اور اگر کسی نے ایسا کیا بھی تو قرآن کو انگریزی تراجم کی رو سے سمجھنے کی کوشش کی، جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے۔ اوّل تو قرآنِ مجید کا کسی زبان میں بھی ترجمہ نہیں ہو سکتا اور پھر جو ترجمے انگریزی زبان میں ہوئے ہیں (خواہ وہ غیر مسلموں کے) ان میں قرآنی اصطلاحات کا ترجمہ عیسائیت کی مروجہ اصطلاحات میں کیا گیا ہے۔ مثلاً خدا کا ترجمہ (GOD) رب کا ترجمہ (LORD) نبی کا ترجمہ (PROPHET) عبادت کا ترجمہ (WORSHIP) دین کا ترجمہ (RELIGION) انگریزی زبان کی ان اصطلاحات کی رُو سے نہ صرف یہ کہ قرآن مجید کا مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اس کا پیغام، اس کی تعلیم، اس کے نظریاتِ حیات اور مقصدِ زندگی مسخ ہو جاتے ہیں اور اسلام بھی باقی مذاہب کی طرح اوہام و ابہام کا مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اسی ضمن میں ان مترجمین نے ایمان کا ترجمہ (FAITH) کر دیا اور چونکہ ان کے ہاں (REASON) دو متضاد چیزیں ہیں اس لئے انہوں نے اسلام کے خلاف بھی یہ اعتراض کر دیا کہ اس میں غور و فکر اور علم و بصیرت کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایمان نام ہے پیش کردہ عقائد کو آنکھیں بند کر کے مان لینے کا، جو ایسا نہیں کرتا وہ کافر ہے۔ اس قسم کے اعتراضات قرآن کریم سے بے خبری کی دلیل ہیں۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ایک علم ہے بالحواس جس کی بنیاد مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ اور انسانی فکر پر ہے اس کے دروازے تمام انسانوں پر یکساں کھلے ہیں اور اُمّتِ مسلمہ کو اس کی تحصیل کی خاص تاکید کی گئی ہے لیکن علم کی ایک اور قسم بھی ہے جسے وحی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ علم خدا کی طرف سے اس کے برگزیدہ انسانوں کو براہِ راست ملا کرتا تھا، جنہیں انبیائے کرامؑ کہا جاتا ہے۔ اس علم میں نبی کے ذاتی مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ یا فکر کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یوں کہیئے کہ یہ اسے خارج سے (OBJECTIVELY) ملتا تھا۔ یہ وحی آخری مرتبہ حضور نبی اکرمؐ کو ملی اور اب اپنی مکمل مکمّل اور غیر محرّف شکل میں قرآنِ مجید میں محفوظ ہے۔ یہ وحی حضرات انبیاء کرامؑ کو کس طرح ملتی تھی۔ اس طریق کی کنہ و ماہیت کیا تھی، یہ بات کسی غیر از نبی کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔

لیکن اگر یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آسکتی تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ ہمارا تعلق اس طریقہ یا ذریعہ سے نہیں جس کی رُو سے یہ علم حضرات انبیاء کرامؑ کو ملتا تھا۔ ہمارا تعلق اس علم سے ہے جو حضور نبی اکرمؐ کو بذریعہ وحی ملا اور

جو کچھ قرآنِ کریم میں محفوظ ہے۔ یعنی ہمارا تعلق اس کتاب کے مندرجات (CONTENTS) سے ہے نہ کہ اس طریق سے جس کی رُو سے یہ نبیٔ اکرمؐ کو ملی تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس کتاب کے مندرجات کو آنکھیں بند کر کے مان لینے کا حکم دیا گیا ہے یا اس میں غور و فکر کی گنجائش ہے۔

غور و فکر کی گنجائش تو ایک طرف، خدا کا حکم یہ ہے کہ قرآن مجید کی ایک ایک آیت کو علم و بصیرت کی رُو سے پرکھو اور عقل و شعور اور تدبّر و تفکّر کی رُو سے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس طرح اگر قلب اور دماغ اس کی صداقت پر مطمئن ہو جائے تو پھر اسے مانو ورنہ مت مانو۔ جس دعویٰ کو قلب و دماغ کے کامل اطمینان کے بغیر مانا جائے اسے ایمان کہا ہی نہ جائے گا۔ ایمان (CONVICTION) کا نام ہے۔ دیکھئے اس حقیقت کو قرآن کس قدر واضح الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ سب سے پہلے وہ قرآن کی دعوت پیش کرنے والے، یعنی حضور نبیٔ اکرمؐ سے کہتا ہے کہ:

"ان سے کہہ میری راہ بالکل صاف اور سیدھی ہے اور وہ یہ کہ جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو علیٰ وجہ البصیرت ایسا کرتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور میرے متبعین بھی ایسا ہی کریں گے۔"

یہ اس لئے کہ جس کتابِ عظیم کی طرف دعوت دی جاتی تھی وہ خود اپنے آپ کو کتابِ مبین (واضح اور روشن کتاب)، برہان (مبنی بر دلائل) اور بصائر اللناس (نوعِ انسان کے لئے وجہ بصیرت) کہہ کر پیش کردہ صداقتوں پر ایمان لاتے ہیں۔ ان کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ سورۃ الفرقان میں مومنین کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"یہ وہ لوگ ہیں کہ اور تو اور جب ان کے سامنے آیاتِ خداوندی بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ایسا نہیں کرتے کہ عقل اور فکر کو بالائے طاق رکھ کر اندھوں اور بہروں کی طرح ان پر گر پڑیں۔ وہ انہیں علم و بصیرت کی رو سے تسلیم کرتے ہیں۔"

(ضمناً) جہاں تک میرا علم میری راہنمائی کرتا ہے مذاہبِ عالم کی مبیّنہ آسمانی کتابوں میں کہیں بھی ان مذاہب کے متبعین کی خصوصیت نہیں بتائی گئی۔ یہ امتیازی خصوصیت صرف قرآن پر ایمان لانے والوں کی بتائی گئی ہے۔ کیا اس کے بعد یہ پوچھنے کی ضرورت رہ جاتی ہے کہ اسلام میں عقل و فکر کی اہمیت کیا ہے؟

جب ایمان علم و بصیرت اور عقل و فکر کی رو سے لایا جانا ہے تو جو لوگ عقل و فکر سے کام نہ لیں انہیں اور تو اور خود رسول اللہ کی تبلیغ بھی کچھ فائدہ نہیں دے سکتی تھی۔ سورج کی روشنی تو اسے ہی فائدہ دے گی جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے گا۔ اسی لئے فرمایا:۔

"ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ تمہاری بات سُن رہے ہیں لیکن وہ درحقیقت تمہاری بات سُن نہیں رہے ہوتے۔ اس لئے وہ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔

سوچو کہ تم ایسے بہروں کو کس طرح سُنا سکو گے۔"

اس سے آگے ہے:

"اور ان میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ بظاہر تمہاری طرف آنکھیں کھولے دیکھ رہے ہوتے ہیں لیکن وہ درحقیقت دیکھ نہیں ہوتے، وہ محض بصارت سے کام لیتے ہیں، بصیرت سے نہیں۔"

یہ کچھ کہنے کے بعد قرآنِ کریم ایک عظیم حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب یہ لوگ صحیح رہنمائی سے محروم رہ جانے کی وجہ سے غلط راستے اختیار کریں گے اور اس طرح تباہی اور بربادی کے جہنّم میں جا گریں گے تو سطحی کے لوگ کہیں گے کہ اللہ نے بڑا ظلم کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ:

"اللہ کسی پر ظلم و زیادتی نہیں کرتا، لوگ اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔"

سعدی کے الفاظ میں ؎

گر نہ بیند بروز شپرا چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

قرآنِ کریم سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے غور و تدبّر شرط ہے:

"یہ لوگ قرآن میں تدبّر نہیں کرتے، ایسا نظر آتا ہے کہ ان کے دلوں نے خود وضع کردہ تالے اپنے اوپر ڈال رکھے ہیں تاکہ ان کے اندر کچھ داخل ہی نہ ہو سکے۔"

"اَقْفَالُھَا" میں ھَا کی ضمیر پر غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ قرآن کا اعجاز کس طرح اُبھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ان کے دلوں پر کسی اور نے تالے نہیں ڈال رکھے، ان کے دلوں نے خود اپنے تالے اپنے اوپر ڈال رکھے ہیں اس کی صحیح تحسین کوئی علم النفس کا ماہر ہی کر سکے گا!

جو لوگ اس دعوت کی مخالفت کرتے ہیں وہ ان سے کہتا ہے کہ اس میں جھگڑنے اور دھاندلی مچانے کی کوئی بات نہیں۔ میں اپنی دعوت دلیل و برہان کی رو سے پیش کرتا ہوں۔

"اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اس کے ثبوت میں دلائل پیش کرو، جس کے دلائل محکم ہوں گے سمجھ لیا جائے گا کہ وہ حق پر ہے۔"

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے علم و بصیرت اور عقل و فکر کو کس قدر اہمیت حاصل ہے اس باب میں ابھی بہت کچھ اور بھی کہا جا سکتا ہے لیکن میں مقطع کے طور پر ایک ایسی درخشندہ مثال پیش کرنا چاہتا ہوں جس کی تابانیاں عالمگیر اور زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہیں۔ حضور نبیٔ اکرمؐ نے عمر بھر قرآنِ کریم کی انسانیت ساز تعلیم پیش کی اور مخالفین نے اس کی اندھا دھند مخالفت کی۔ آخر الامر حضورؐ نے ایک دن ان سے کہا کہ میں عمر بھر تم سے بڑی تفصیلی گفتگوئیں کرتا رہا ہوں لیکن آج میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں، صرف ایک بات۔

"قُلْ اِنَّمَا اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ (۳۴/۲۶)۔

انہوں نے کہا کہ یہ صرف ایک بات کہنا چاہتا ہے اس کے سُن لینے میں کیا حرج ہے۔ انہیں اس طرح آمادہ کرکے آپ نے فرمایا کہ وہ بات ایسی معمولی نہیں کہ تم اسے یونہی چلتے چلتے سُن لو۔ وہ بڑی اہم بات ہے اس لئے ذرا کھڑے ہو کر دل کے کانوں سے سنو۔ سب نہیں تو ایک ایک دو دو کر کے ہی کھڑے ہو جاؤ۔

جب آپ نے انہیں اس طرح نفسیاتی طور پر اپنی طرف متوجہ کر لیا تو فرمایا۔ جو بات تم سے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ۔

"تم سوچا کرو۔ غور و فکر کی عادت ڈالو۔ اگر تم نے اس پر عمل کر لیا تو میرا مقصد بھی حاصل ہو جائیگا اور تم بھی تباہی سے بچ جاؤ گے۔"

آپ غور کیجئے کہ کیا یہ "مقطع کا بند" اس بات پر حرفِ آخر نہیں؟

اسلام میں فکر کی اہمیت کے بعد ہم فکر کی توسیع کی طرف آتے ہیں۔ توسیع سے مراد اگر یہ ہے کہ فکر کا دائرہ کس قدر وسیع ہے اور زندگی کے کون کون سے گوشے اس کے اندر آتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ علم کی طرح فکر کی وسعت بھی حدود فراموش ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے انسانی زندگی ایک جوئے رواں کی طرح اس دنیا سے اگلی دنیا تک مسلسل جاتی ہے اور وہ ان دونوں دنیاؤں کو فکر کی جولانگاہ قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"اس طرح اللہ تعالیٰ حقائق کو واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ دنیا اور آخرت کی زندگی پر غور و فکر کرو۔"

اس میں شُبہ نہیں کہ اُخروی زندگی کی حقیقت و ماہیت کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ نہیں سکتے لیکن اس دنیا کے متعلق قرآنِ کریم نے جو کچھ تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے اس پر غور و فکر سے ہم اُس کے مقصد اور غایت کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے فکر کا دائرہ دنیا اور آخرت دونوں پر محیط ہے لیکن سردست ہم اپنے آپ کو اسی دنیا تک محدود رکھتے ہیں۔

اگر فکر کی توسیع سے مراد یہ ہے کہ کیا یہ کسی زمانے تک محدود تھا یا اسے اس سے آگے بڑھ کر موجودہ دور تک بھی لایا جا سکتا ہے، تو اس ضمن میں سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ کسی خاص زمانے کے ساتھ مختص نہیں تھا، نہ مختص ہو سکتا ہے۔ قرآنِ مجید تمام نوعِ انسانی کے لئے ابدی طور پر ضابطۂ ہدایت ہے اس لئے اس کی تعلیم بھی ابدی ہے۔ اس نے جو تدبّر و تفکّر کا حکم دیا ہے تو یہ بھی دائمی ہے اس لئے تدبّر و تفکّر کا سلسلہ بھی ختم نہیں ہو سکتا۔

اس فکر و تدبّر کے دو گوشے ہیں۔ ایک خارجی کائنات اور دوسرا انسانی معاملات کی دنیا۔ قرآنِ مجید نے کہا ہے کہ فطرت کے رموز و اسرار، تخلیقِ کائنات کے ساتھ ہی وجود میں آ گئے تھے لیکن یہ انسانی نگاہوں سے پنہاں تھے اور

اس انتظار میں کہ انسانی علم و فکر ترقی کرتا ہوا آگے بڑھے اور ان حقائق پر پڑے ہوئے پردوں کو بے نقاب کرتا چلا جائے واضح رہے کہ علوم سائنس کے محقق ان حقائق کو ایجاد نہیں کرتے انہیں صرف بے نقاب کرتے ہیں۔ قرآنِ مجید میں ہے:

"ہم انہیں عالمِ انفس و آفاق (خارجی کائنات اور انسانی دنیا) میں اپنی نشانیاں (آیات) دکھاتے جائیں گے تاآنکہ یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجائے کہ قرآن کا ہر دعوے صداقت پر مبنی ہے۔"

یعنی عالمِ انفس و آفاق کی جو حقیقت بے نقاب ہو گی وہ قرآنِ حکیم کی کسی نہ کسی دعوے کی صداقت کی شہادت بن کر سامنے آئے گی۔ (ضمناً) دنیا میں مذہب اور سائنس میں تصادم چلا آرہا ہے۔ سائنس کو مذہب کی دشمن اور مذہب کو سائنس کی ضد کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس قرآن یہ کہتا ہے کہ سائنس کا ہر مبنی بر حقیقت انکشاف اس کے کسی نہ کسی دعوے کی صداقت کی شہادت ہو گا۔ بہرحال ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قرآنِ مجید کی رو سے انسانی فکر کا فریضہ ہے کہ وہ رموزِ کائنات کو بے نقاب کرتا چلا جائے اور اس طرح فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے۔ اس کا ارشاد ہے:

"کائنات کی پستیوں اور بلندیوں (ارض و سمٰوٰت) میں جو کچھ ہے خدا نے ان سب کو تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے، ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیں، حقیقت تک پہنچنے کی بہت بڑی نشانیاں ہیں۔"

بالفاظِ دیگر توسیعِ فکر اور تسخیرِ کائنات لازم و ملزوم ہیں۔ کائنات کی وسعتیں ہنوز انسان کے احاطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتیں۔ انسان غاروں سے نکل کر چاند اور مریخ تک پہنچ گیا ہے لیکن اربابِ فکر و نظر کا کہنا ہے کہ اس نے ابھی تک اس بحرِ بے پایاں کے کنارے کو بھی نہیں چھوا۔ چہ جائیکہ اس نے اسے کلیتہً مسخر کر لیا ہو اس سے آپ انسانی فکر کی وسعت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

تسخیرِ کائنات کا ذکر آگیا تو دیکھئے کہ قرآنِ کریم ہمیں کہاں تک لے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی کرۂ ارض تک ہی محدود نہیں۔ فضائی کروں میں بھی ایسے ہیں جن میں زندگی موجود ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے:

"اور اس جاندار مخلوق میں بھی جو زمین اور فضائی کروں میں بکھری پڑی ہے۔"

اس سے اس نے بتایا کہ زندگی دوسرے کروں میں موجود ہے اس میں اور اس آیت کے اگلے ٹکڑے میں اس نے جو کچھ کہا ہے وہ اس حقیقت کی بیّن شہادت ہے کہ قرآنِ حکیم انسانی فکر کی تخلیق نہیں، اس کا سرچشمہ ماورائے فکرِ انسانی ہے۔ اس نے کہا ہے:

"وہ اس پر بھی قادر ہے کہ کسی دن اپنے قانونِ مشیت کی رو سے کرۂ ارض اور فضائی کروں میں ملاپ پیدا کر دے ان میں ربطِ باہمی پیدا ہو جائے۔"

غور کیجئے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے ساری دنیا کے دانش وروں کی فکر مل کر بھی یہ کچھ کہہ سکتی تھی ؟ یہ ہیں انفس و آفاق کے وہ رموز جو قرآنِ مجید کی دفتین میں پوشیدہ ہیں اور جو فکرِ انسانی کی توسیع کے ساتھ بے نقاب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ ہیں ؎

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست　　عصرہا پیچیدہ در آفاتِ اوست
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است　　گیر اگر در سینہ دل معنی رس است
بندۂ مومن ز آیاتِ خدا است　　ہر جہاں اندر براو چوں قبا است
چوں کہن گردد جہانے در برش　　مید ہد قرآں جہانے دیگرش　　(جاوید نامہ)

لیکن فکر کی یہ توسیع تو اقوامِ مغرب کے حصے میں آئی ہے۔ ہم (مسلمان) کہ جنہیں اس کتابِ عظیم کا وارث قرار دیا گیا تھا اس میدان میں ان اقوام سے صدیوں پیچھے ہیں۔ ہم جب بھی علوم سائنس کا ذکر کرتے ہیں تو ابن مسکویہ، رازی، بوعلی سینا وغیرہ سے آگے نہیں بڑھتے جو صدیوں پہلے ہو گزرے ہیں۔ ہماری فکر کی حدِ آخر ان ہی محققین کا زمانہ ہے۔ اس کے بعد ہم پر جمود طاری ہو چکا ہے۔ لہٰذا ہمارے ہاں توسیعِ فکر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم نے جب بھی اس جمود کو توڑنا چاہا تو سوال فکر کی احیاء نو (RENAISANCE) کا ہوگا۔ ابھی تو کیفیت یہ ہے کہ ؎

منزلِ مقصود قرآں دیگر است　　رسم و آئینِ مسلماں دیگر است　　(جاوید نامہ)

لیکن مغربی اقوام کی فکر بھی عالمِ آفاق (خارجی کائنات) ہیں محصور ہو کر رہ گئی ہے۔ عالمِ انفس (انسانی دنیا) کی طرف ان کی نگاہ ہی نہیں اٹھی۔ برٹرنڈ رسل کے الفاظ ہیں ؛

"ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم نے خارجی قوتوں کو بے حساب انداز سے مسخر کر لیا ہے۔ لیکن ان انسانی قوتوں کو قطعاً مسخر نہیں کیا جو خود ہمارے اندر ہیں۔"

تنہا سائنس کے انکشاف اور فطرت کی قوتوں کی تسخیر، انسانی مسائل کو حل نہیں کر سکتی۔ مغرب ہی کے ایک اور مفکر ڈاکٹر میسن (J. W. T. MASON) نے اپنی کتاب (CREATIVE FREEDOM) میں کہا ہے :

"ہم نے زندگی کی ابتدا سائنس کی کاریگری سے اس وثوق کے ساتھ کہ مادی کامرانیاں زندگی کے عقدوں کو حل کر دیں گی لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم غلطی پر تھے۔ زندگی کے مسائل اتنے آسان نہیں۔"

اتنا ہی نہیں کہ اس سے انسانی مسائل کا حل دریافت نہیں ہو سکا اس سے انسان تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف کشاں کشاں چلا جا رہا ہے اور یورپ کے دانشور اس کی اس تباہی پر ماتم کر رہے ہیں لیکن بے بس ہیں اور اپنی بے بسی کا اعتراف اور اظہار برملا کرتے ہیں۔ (مثلاً) ڈاکٹر ولیم برینڈ لکھتا ہے :

"انسان ابھی اس مقام سے بہت دُور ہے کہ وہ سیکھ لے کہ وہ اپنے آپ پر کس طرح حکومت کر سکتا ہے؟ انسان ہر جگہ پریشان اور بے یقینی کے عالم میں پھر رہا ہے۔ قدیم اقدار ختم ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ کسی اور نے نہیں لی۔ دنیا کے بیشتر حصّے پر تعمیری قوتوں کے بجائے تخریبی قوتیں چھا چکی ہیں اور انسان نے جو کچھ صدیوں سے حاصل کیا تھا وہ سب ختم ہو رہا ہے انسان نے اپنے طبیعی ماحول پر اچھا خاصا قابو پا لیا ہے لیکن اس نے اپنے جذباتی ماحول پر قابو پانا نہیں سیکھا۔"

قرآنِ کریم نے عالمِ آفاق کے ساتھ عالمِ انفس پر غور و فکر کی تاکید اس لئے کی تھی کہ "انسان اپنے پر حکومت کرنا بھی سیکھ لے"۔

"کیا تم نے کبھی اپنے آپ پر بھی غور کیا ہے" کا مقصد یہی تھا۔ اس حصّے کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے کہ انسان بُری طرح پریشان و تباہ حال پھر رہا ہے کہ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

قرآنِ کریم نے اسی قسم کی اقوامِ سابقہ کے متعلق کہا تھا کہ جب انہوں نے اقدار و قوانینِ خداوندی سے بے اعتنائی برتی تو وہ تباہ و برباد ہو گئیں اور خارجی کائنات کے متعلق ان کا علم ان کے کسی کام نہ آیا:

"جب انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی تو ان کا علم و فکر انہیں تباہی سے بچا نہ سکا۔"

فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں اقدارِ خداوندی کے مطابق عالمگیر انسانیت کی منفعت کے لئے عام کرنے کا فریضہ اُس امت نے ادا کرنا تھا جسے کتاب اللہ کی وارث قرار دیا گیا تھا۔ لیکن جو امت عالمِ آفاق کو مسخر نہ کر سکی وہ عالمِ انفس کے مسائل کا حل کیا پیش کرتی؟ وہ تو خود اپنی مشکلات کے حل کے لئے دوسروں کی محتاج ہے اور یہ سب اس لئے کہ اس نے اپنی فکر و تدبر کے چراغ گل کر رکھے ہیں۔ اس طرح ہم زندگی کی کون کون سی تاریک راہوں میں بھٹکتے پھر رہے ہیں، اس کی تفصیل طول طویل ہے۔ ہم سردست اس کے صرف اس گوشے کو لیتے ہیں جس میں ہماری پریشانیٔ فکر و نظر اُبھر کر سامنے آ رہی ہے اور وہ ہے پاکستان میں آئین و قوانین سازی کا مسئلہ۔

ہم نے اس خطۂ زمین کو اس لئے حاصل کیا تھا کہ یہاں قرآنی اقدار و قوانین کو نافذ کر کے اس مملکت کو اسلامی بنایا جا سکے۔ قرآنِ مجید نے اسلامی اور غیر اسلامی مملکت میں نہایت روشن خطِ امتیاز کھینچ دیا ہے جہاں کہا ہے:

"جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہیں کافر کہا جاتا ہے۔"

یعنی اسلامی مملکت وہ ہے جس میں جملہ امور قرآنِ مجید کے مطابق سرانجام پائیں۔ قرآنِ مجید کی کیفیت یہ ہے کہ اس نے (بجز چند احکام) امورِ مملکت کے متعلق اصول و اقدار دیئے ہیں جنہیں حدود اللہ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ نے باؤنڈری لائن متعین کر دی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے ہر زمانے کی اسلامی مملکت، امورِ حکومت سرانجام دے گی۔ یہ حدود و اقدار تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے اور ان کے اندر رہتے ہوئے جو آئین و قوانین مرتب کئے جائیں گے وہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ بالفاظِ دیگر انسانی فکر صرف ان حدود کی پابند ہو گی کے اندر رہتے ہوئے اسے اپنی کارفرمائی کے لئے پوری پوری آزادی ہو گی۔ جوں جوں زمانے کے تقاضے بدلتے اور آگے بڑھتے جائیں گے۔ اس فکر میں توسیع ہوتی جائے گی۔ علامہ اقبالؒ نے اسلامی مملکت کی اس خصوصیت اور انفرادیت کو اپنے خطبات میں بڑے بصیرت افروز اور دل نشین انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کل کی روحانی اساس ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو اس کے لئے ضرور ہو گا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (عناصر) میں تطابق اور توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں، اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا امکان ہی نہیں۔ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کی عمرانی اور سیاسی زندگی میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جسطرح قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے، لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی ہیئت اور ترکیب میں کون کا اصولِ حرکت کارفرما ہے۔ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔ (چھٹا خطبہ)

اجتہاد نام ہی حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے پیش آمدہ مسائل کے فکری طور پر حل دریافت کرنے کا ہے جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے (اور جسے علامہ اقبالؒ نے اپنے مندرجہ بالا اقتباس میں تحریر فرمایا ہے)، ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہمارا فکری عمل ایک خاص زمانے تک محدود تھا۔ اس کے بعد اسلام میں فکر کی گنجائش نہیں رہی۔ لہٰذا جو قوانین اور مسالک اس زمانے میں وضع ہو چکے تھے وہ ابدی اور غیر متغیر ہیں۔ ان میں نہ حک و اضافہ ہو سکتا ہے نہ تغیر و تبدل۔ بالفاظِ دیگر اس کے معنے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تدبر و تفکر کا جو حکم دیا تھا وہ ایک خاص زمانے تک کے لئے تھا اس کے بعد

وہ حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ لہٰذا، اب اسلام سے متعلق کسی معاملے میں بھی غور و فکر سے کام نہیں لیا جا سکتا۔

علامہ اقبالؒ اس باب میں لکھتے ہیں۔

"آیئے اب ایک نظر اُن اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلے میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عملِ ارتقاء ہے اس کی مقتضی ہے کہ نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمائے سے راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ (چھٹا خطبہ)

آپ اسے فکر کی توسیع کہہ لیجئے یا اس کا احیائے نو، اس کے بغیر زندگی کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

ضروری اطلاع

پیشگی کھاتہ داران کو ان کے بقایاجات کی اطلاع دی جا چکی ہے اُن سے التماس ہے کہ وہ ۳۱ دسمبر ۹۲ء تک واجبات ادا فرما دیں تاکہ یاد دہانی کی ضرورت نہ رہے۔

(ناظم ادارہ)

"یومِ قائدِ اعظمؒ کی یاد میں"

صفدر سلیمی صاحب کے طویل مضمون سے اقتباس

قائدِ اعظم ۔۔۔ محمد علی جناحؒ

زباں پہ بارِ الٰہا یہ کس کا نام آیا

سرسیدؒ و اقبالؒ کی مساعیٔ جمیلہ کے بعد جو عظمت آفریں شخصیت ہمارے سفینۂ حیات کی ناخدائی کے لئے آگے بڑھی اور اسے ساحلِ مراد سے ہمکنار کر کے دم لیا وہ قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ تھے۔ تاریخ شہادت دے گی کہ اس قائدِ جلیل کی شانِ قیادت نے اپنی تگ و تاز کے پورے دَور میں ایک لمحہ کے لئے بھی جذباتی رجحان کی دل فریبیوں کا سہارا نہیں لیا۔ ہندو قوم تعلیم و ترقی اور فکر و شعور کی سنجیدگی میں مسلمانوں سے کس قدر آگے تھی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں بھی گاندھی جی جیسی شہرۂ آفاق شخصیت کو اپنی لیڈر شپ کا سکہ جمانے کے لئے مہاتمائی روپ دھارنا پڑا اور وہی انداز اختیار کرنے پڑے جو ہندو کے جذبات کو اپیل کر سکیں۔ لیکن کیسا حیرت انگیز ہے سیاسیاتِ ہند کی تصویر کا یہ دوسرا رُخ کہ جناح مسلمانوں جیسی جذباتی قوم کی قیادت کے لئے میدان میں آئے اور انہوں نے قومی جذبات پر اثر انداز ہونے کے لئے اس قسم کا کوئی ادنیٰ کھیل کھیلنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ زندگی کے آخری سانس تک انہوں نے اس قسم کی دل فریب نمائشوں سے کلیتہً اجتناب کیا۔ یہی ہے جناحؒ کی عظمت کا وہ امتیازی نشان جسے ہم ان کے کمالات میں سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور یہی تھا ہماری فتحِ عظیم کا وہ حقیقی راز جو حصولِ پاکستان کا حقیقی امین قرار پائے گا۔

قیادتِ ملّی اور اقبالؒ کا حُسنِ انتخاب

اقبالؒ نہیں چاہتے تھے کہ وہ ایک مفکّر کے مقام سے تجاوز کر کے اسلامیانِ ہند کے منصبِ قیادت کو اپنائیں۔ ان کے خلوص کا تقاضا یہی ہو سکتا تھا ۔۔۔ ان کی نگاہیں اس قائد کی تلاش میں تھیں جو قومی زندگی کے لئے اور نازک ترین مرحلوں میں قیادت کی پُر پیچ ذمہ داریوں سے دو ٹوک انداز سے عہدہ برآ ہو سکے اور کوئی اس کے حُسنِ سلوک پر حرف گیری کی جرأت نہ کر سکے۔ یہ صرف جناحؒ تھے جو ان کے حُسنِ انتخاب کے شایانِ شان قرار پا سکے اور ان کی کوششوں سے قوم کو وہ قائدِ اعظم مل گیا جس کے حسنِ تدبّر کے صدقے میں پاکستان جیسی عظیم مملکت کا وجود نقشۂ عالم پر مرتسم ہوا۔ ۱۱ جون ۱۹۳۷ء

کو مسٹر جناح کے نام ایک مکتوب میں اقبالؒ نے یہ لکھا تھا کہ

"ہندوستان میں آپ ہی کی ذات ایسی ہے جس سے قوم کو یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ مستقبل میں جو سیلاب آنے کا خدشہ ہے اس میں صرف آپ ہی مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کر سکیں گے۔"

یہ تھیں وہ امیدیں جو اقبال نے قوم کی طرف سے جناح سے وابستہ کیں اور تاریخ نے شہادت دی کہ جناح نے انہیں بہ حُسنِ کمال پورا کر دکھایا۔ اقبالؒ کے خطاب الٰہ آباد کے ٹھیک دس سال بعد جناحؒ ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان کو لے کر میدان میں آ چکے تھے اور اس کے بعد اس قرارداد کو حاصلِ تکمیل تک پہنچانے کے لئے دس کروڑ مسلمانوں کی وہ تگ و تاز شروع ہو گئی تھی جو ۱۹۴۷ء میں حصولِ پاکستان پر منتج ہوئی۔ اس مدت میں قائداعظمؒ کی معرکہ آرائیوں کی تفصیل تاریخ کا ایک مستقل باب ہے اور الگ الگ داستان۔ یہاں ہم قائداعظمؒ کے بعض اہم خطابات سے ان مقاصد کو روشنی میں لائیں گے جو تحریکِ پاکستان کے لئے اساسی درجہ رکھتے ہیں۔

انہوں نے ۲۶ دسمبر ۱۹۴۳ء کو کراچی میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی تقریب پر حاضرین سے پہلے یہ سوال کیا کہ

"وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں؟ وہ کونسی سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے؟ اور وہ کون سا لنگر ہے جس کی بدولت اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔"

اور پھر خود ہی ان اہم سوالات کے جواب میں فرمایا:

"وہ بندھن اور وہ رشتہ، وہ چٹان اور وہ لنگر خدا کی کتابِ عظیم قرآنِ کریم ہے۔ مجھے یقینِ محکم ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسول اور ایک امت۔"

۸ مارچ ۱۹۴۴ء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے واضح کیا کہ

"ہندو اور مسلمان، خواہ ایک ہی قصبہ یا گاؤں میں کیوں نہ رہتے ہوں، کبھی ایک قوم کے اجزاء نہیں بن سکتے۔ وہ ہمیشہ دو الگ الگ عناصر کی حیثیت سے رہے ہیں.... پاکستان تو اسی دن وجود میں آ گیا تھا جب (ہندوستان میں) پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے کہ جب کہ یہاں ابھی مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔"

(تقاریرِ جناح۔ حصہ دوم)

اور پھر اس کے بعد (۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء) کو ایڈورڈز کالج پشاور کے طلباء کے سامنے تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔

"ہم دو قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر بھی ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ ہم اسی ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔" (ایضاً صفحہ ۴۵)

۱۸۔ مارچ ۱۹۴۴ء کو پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس (منعقدہ لاہور) میں تحریکِ پاکستان کی اہمیت واضح کرتے ہوئے انہوں نے پنجاب کے مسلم طلباء کو ایک نئے عزم اور تازہ ولولوں سے سرشار کر دیا۔ اس تقریر میں انہوں نے فرمایا۔

"پاکستان کے تصور کو، جو اب مسلمانوں کے لئے ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے، مسلمانوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ان کی حفاظت، نجات اور تقدیر کا راز اسی میں مضمر ہے۔ اسی سے یہ آواز اقصائے عالم میں گونجے گی کہ دنیا میں ایک ایسی مملکت معرضِ وجود میں آگئی ہے جو اسلام کی عظمتِ رفتہ کو از سرِ نو پھر زندہ کرے گی۔" (ایضاً صفحہ ۵۸)

۱۸۔ جون ۱۹۴۵ء کو قائدِ اعظمؒ ایک بار پھر صوبہ سرحد کے شاہین بچوں کو ایک اہم پیامِ انقلاب دے رہے تھے۔ اس پیغام میں انہوں نے فرنٹیئر مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی وساطت سے اسلام کے نونہالوں پر واضح کیا تھا کہ

"پاکستان سے مطلب یہی نہیں کہ ہم (غیر ملکی حکومت سے) آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے (درحقیقت) مراد وہ مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ یہ بیش بہا تحفہ اور خزانہ ہمیں وراثت میں ملا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس سے ہم خود ہی متمتع نہیں ہوں گے بلکہ ہمارے ساتھ اور بھی فیضاب ہوں گے ..... ہم نے صرف اپنی آزادی حاصل نہیں کرنی بلکہ اس قابل بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ (ایضاً صفحہ ۳۶۷)

مملکت کا اسلامی تصور

قائدِ اعظمؒ کے خلاف مفاد پرست گروہ کی طرف سے ہمیشہ یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ وہ اسلام کے معاملہ میں نابلد سے تھے۔ قائدِ اعظمؒ نے مخالفت کے اس گھناؤنے انداز کا جواب ہمیشہ خود اعتمادی کی مسکراہٹ سے دیا کیونکہ ملت کے عظیم ترین قائد کی حیثیت سے انہوں نے اپنے قافلے کو جس اسلامی منزل کی طرف آگے بڑھایا تھا اس کی موجودگی میں یہ کیوں کر ممکن تھا کہ وہ اسلام کے زندہ پائندہ حقائق سے بے خبر رہتے۔ یہ درست ہے کہ قائدِ اعظمؒ کو فقہی موشگافیوں کا درک حاصل نہ تھا لیکن جہاں تک اسلام کی دینی عظمت و برتری کا تعلق ہے انہوں نے اس کی روح تک کو سمجھنے میں پوری عرق ریزی سے کام لیا تھا۔ اس سلسلے میں ان کے گہرے اسلامی مطالعہ کا اندازہ اس انٹرویو سے بخوبی ہو سکے گا جو انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد

دکن کے طلبا کو دیا تھا۔ بڑے اہم سوالات کئے تھے ان طلبا نے اور اہم سطور ذیل میں اس سلسلۂ سوال و جواب کو بعینہٖ پیش کرتے ہیں جو اورینٹ پریس کی رپورٹ کے حوالے سے اپریل ۱۹۴۲ء کے طلوعِ اسلام میں شائع ہوا تھا۔

سوال: مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب:۔ اشتراکیت، بالشویت یا اس قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک دراصل اسلام اور اس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں ان میں اسلام کے اجزا کا سا ربط اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔

سوال:۔ ترکی حکومت تو سیکولر اسٹیٹ ہے۔ کیا اسلامی حکومت اس سے مختلف ہے؟

اس سوال کا پہلا حصہ ایک جداگانہ عنوان سے متعلق ہے لیکن دوسرے حصے میں قائدِ اعظمؒ نے جو کچھ کہا ہے اس کے ایک ایک لفظ میں ہماری زندگی میں پیدا شدہ تمام مشکلات و موانعات کا نکھرا ہوا حل موجود ہے اور اس سے وہ تمام الجھنیں اور پیچیدگیاں ختم ہو جاتی ہیں جو اسلامی دستور اور اسلامی مملکت کے سلسلے میں ہمارے ذہنوں میں پائی جاتی ہیں۔ قائدِ اعظمؒ نے جواباً فرمایا تھا۔

جواب:۔ ترکی حکومت پر میرے خیال میں سیکولر اسٹیٹ کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی۔ اب رہا اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز، تو یہ بالکل واضح ہے کہ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعلیم کا عملی ذریعہ قرآن کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

ان الفاظ پر ایک بار پھر غور کیجئے کہ

اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔

سنجیدہ فکر کا مطالبہ کیا صدیوں کی ملوکیت کے بعد ایک مملکت کو اسلامی بنانے میں جو الجھنیں حائل رہی ہیں انہیں ختم کرنے کے لئے یہ الفاظ قندیلِ راہ کی حیثیت نہیں رکھتے تھے؟ اگر ملت جذبات پرستی سے بالاتر ہو کر حسنِ نیت اور خلوصِ فکر کی روشنی میں اپنا مستقبل متعین کرنا چاہیئے تو اسے لامحالہ ان الفاظ کو مشعلِ راہ بنانا پڑے گا اور اس کے بغیر کوئی اور چارۂ کار نہ ہو سکے گا۔ سرسیدؒ، اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ نے اس بدنصیب

[illegible] کو جذبات پرستی کی تند آندھیوں اور مسلک تقلید کی گہری تاریکیوں سے نکال کر فکر و بصیرت کی روشنی میں سفرِ زندگی کے قابل بنایا تھا لیکن قوم کی بدنصیبی کی انتہا یہ تھی کہ حصولِ پاکستان کی فاتحانہ معرکہ آرائی کے بعد جب قیادت کا میدان خالی ہو گیا تو قوم کے جذبات سے کھیلنے والے مفاد پرست عناصر پھر آگے بڑھ آئے اور ہمارے سب سے بنیادی مسائل کو بھی جو انتہائی سنجیدہ فکر کے محتاج تھے، جذباتی رجحانات کے سپرد کر دیا اور اس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔

سرسیدؒ کی کامیاب قیادت سے قبل بھی ہمارے عوام مدتوں جذباتی شورشوں میں مگن چلے آئے اور ان شورش پسندیوں نے ان کی اجتماعی قوت کو مضمحل بنا کر رکھ دیا۔ سرسیدؒ کی صحت مند اور مضبوط قیادت نے بے نتیجہ شورشوں اور ہنگاموں کی اس نمائش کو ختم کیا اور افرادِ ملت میں یہ صلاحیت بحال کی کہ وہ مسائل زندگی سے خالص عقل و فکر کی سنجیدگی کے ذریعے عہدہ برآ ہوں ہنگامہ خیزیوں اور زوال پذیریوں کے اس ماحول میں یہ کارنامہ بہت بڑا معجزہ تھا۔ سرسید کے بعد اقبالؒ آئے اور اپنی بصیرتِ قرآنی جلوہ باریوں سے ہر نشیب و فراز میں افکارِ تازہ کی روشنی پھیلا دی اور سب کا رُخ نشانِ منزل کی طرف پھیر دیا۔

قومی زندگی کی یہ منزل بڑا ہی کٹھن مرحلہ ثابت ہوئی۔ یہاں سیاست کے مغربی تصورات نے ذہنوں پر پورا تسلط جما رکھا تھا۔ اگرچہ اقبالؒ کے انقلاب آفریں نغمے ان تصورات کا جادو توڑ چکے تھے لیکن ایوانِ حکومت کا ہر فیصلہ انہی کی رو سے طے پاتا تھا اور بین الاقوامی دائروں میں بھی انہی تصورات کی کارفرمائی قائم تھی۔ یہ شرفِ عظیم صرف قائداعظمؒ کی قسمت میں لکھا تھا کہ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا دعویٰ لے کر ان بارگاہوں میں داخل ہوں اور دلائل و براہین کی بے پناہ [illegible] بے مثال قوت سے نہ صرف مروجہ سیاسیات کے مسلمہ ضابطوں کو غلط ثابت کر دیں، بلکہ انگریز اور کانگریس جیسی عظیم الشان قوتوں کو اپنے دعوے کی عظمت و صداقت قبول کرنے پر مجبور کر دیں ـــ آسمان کی نگاہوں نے اس صدی میں فراست اور تدبر کا اس سے عظیم تر شاہکار نہیں دیکھا اور مملکتِ پاکستان کا وجود اس فتح مبین کی زندہ جاوید شہادت ہے۔

قائداعظمؒ کے اس شاہکار کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ انہوں نے قومی فکر و شعور کی سنجیدگی کو جو سرسیدؒ و اقبالؒ کی کوششوں کا نتیجہ تھی، بدستور قائم رکھا۔ ان کے مخالفین نے قدم قدم پر عوامی جذبات کو ابھارا لیکن قائداعظمؒ کا ہر [illegible] خطاب فکر و بصیرت کی اسی سنجیدگی کا آئینہ دار تھا۔

”اگر اقوامِ عالم میں حقیقی عظمت حاصل کرنا چاہتے ہو تو جذبات سے کھیلنے کی بجائے حقائق سے عہدہ برآ ہونا سیکھو۔“

[illegible] جنگ کا نعرہ جس کا آغاز سرسیدؒ سے ہوا، جسے فکرِ اقبالؒ نے توانائیاں بخشیں اور جسے قائداعظمؒ کے [illegible] نے فاتحانہ انجام سے ہمکنار کیا۔ قائداعظمؒ کے سانحۂ ارتحال کے بعد یہ حیات بخش نعرہ جذباتی شورشوں کی نذر ہو

میں دب گیا۔ یہ عناصر چاہتے تھے کہ قوم کی تعمیری صلاحیتوں کو پھر ان شورش پسندیوں کا شکار بنا دیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ سرسیدؒ، اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے حقیقی جانشین ملت کو اس حادثہ سے بچالیں گے۔

اعلان

چیئرمین فرانک ایجوکیشن سوسائٹی نے اپنی تعلیمی درس گاہوں کے نصاب کی ترتیب کے لئے ایک مشاورتی کمیٹی کا اعلان کیا ہے۔ حلقہ طلوعِ اسلام میں سے جو خواتین و حضرات تعلیمی مشاغل سے بہرہ ور ہوں اس مشاورتی کمیٹی کا رکن بن سکتے ہیں۔ ان کے لئے فرانک ایجوکیشن سوسائٹی کی رکنیت لازمی نہیں۔ ان کا رابطہ براہ راست چیئرمین فرانک ایجوکیشن سوسائٹی کے ساتھ ہوگا۔ حلقہ طلوعِ اسلام سے باہر بھی تعلیمی ماہرین اس کارِ خیر میں حصہ لیکر اپنی آراء سے مستفید فرما سکتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبدالودود
چیئرمین فرانک ایجوکیشن سوسائٹی
۵۰۔ عثمان بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور۔
۵۴۶۰۰

حضرت مسیح علیہ السلام کی انقلاب آفریں تعلیم

عیسائیت کی مروّجہ تعلیمات کی رُو سے حضرت مسیح علیہ السلام کی شخصیت کا جو نقشہ سامنے آتا ہے وہ کچھ اس نوعیت کا ہے کہ خدا کے اس جلیل القدر پیغمبر کی زندگی ایک تارک الدنیا اور عاجز و ناتواں زاہد گوشہ نشین کی سی زندگی تھی اور انہوں نے قدوسیوں کی جو جماعت پیدا کی، وہ بھی دربدر پھرنے والے مفلوک الحال فقیروں کا سا ایک گروہ تھا جو مسکینی، عاجزی اور بیچارگی میں برّہ معصوم کی طرح زندگی بسر کرتا رہا۔ کچھ اس قسم کی تعلیمات آپ کی ذاتِ گرامی کی طرف منسوب کی جاتی ہیں کہ ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسرا گال آگے بڑھا دو۔ جو کوئی کُرتا لینا چاہے اُسے از خود چغہ اُتار کر دے دو۔ جو ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس تک چلے جاؤ۔ دشمن سے بھی محبت کرو۔ شریر کا مقابلہ نہ کرو۔ ظالم سے ظلم کا انتقام نہ لو۔ مظلومی، عاجزی اور انکساری کی زندگی بسر کرو وغیرہ وغیرہ۔

یہ الفاظ بظاہر بڑے خوش آئند اور نگاہ فریب نظر آتے ہیں لیکن جن لوگوں کی نگاہیں قرآنی حقائق پر ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کی تعلیم کبھی آسمانی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ انہیں معلوم ہے کہ تمام انبیائے کرامؑ اس دنیا میں ایک انقلابِ عظیم کی دعوت لے کر آئے تھے۔ ان کی بعثت کا مقصدِ اولیٰ ہی ظلم و جبر کی قوتوں کے پنجے توڑ کر مظلوم و مقہور نوعِ انسانی کو آزادی اور سربلندی عطا کرنا تھا۔ ان کی حیاتِ طیبہ اس مقدس فریضہ کی امین تھی کہ انسانوں کو بے بسی اور بیچارگی کے بندھنوں سے نجات دلا کر کشادِ زندگی سے بہرہ ور کیا جائے۔ ان سب کی دعوتِ انقلاب اس نصب العین کی نقیب تھی کہ اولادِ آدم کو ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت اور اسی قسم کی دوسری زنجیروں میں مقید نہیں رکھا جا سکتا۔

مسیح علیہ السلام یقیناً اسی انقلاب آفریں اور جہاد انگیز پیغام کے داعی تھے اور انہوں نے اولوالعزم قدوسیوں کی جو جماعت تیار کی تھی ان میں سر دھڑ کی بازی لگانے کے ولولے اسی شدّت آرزو اور بے تابیٔ تمنّا کے ساتھ موجود تھے جو دیگر انبیائے کرامؑ کے رفقائے جلیل ہیں۔ چنانچہ کے ایک درسِ قرآنی میں خود پرویزؒ صاحب نے (خود ناجیل کے حوالوں سے) حضرت مسیح علیہ السلام کی شخصیتِ عالیہ اور دعوتِ انقلاب کی جو نکھری نکھری اور اجلی اجلی تصویر پیش

کی وہ اسی حقیقتِ مستور کی نقاب کشائی کر رہی تھی اور اس سے یہ حقیقت اُبھر کر نگاہوں کے سامنے آگئی تھی کہ جس طرح صاحبِ ضربِ کلیم نے اپنی دعوتِ انقلاب کی لرزہ خیز قوتوں کے زور پر فرعون کی ملوکیت، قارون کی سرمایہ داری اور ہامان کی مذہبی پیشوائیت کی مہیب قہرمانیوں سے ٹکر لی۔ بعینہٖ اسی عزم و جلال سے مسیح علیہ السلام بھی بنی اسرائیل کو رومی شہنشاہیت، سرمایہ داری اور یہودی علماء و مشائخ کے استبداد سے نجات دلانے آئے تھے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو حضرت مسیح علیہ السلام کی راہ میں جو مشکلات حائل تھیں وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی بڑھ چڑھ کر تھیں اور سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ خود بنی اسرائیل اپنے احبار و رہبان کی قیادت میں ان کے خون کے پیاسے اور جان کے لاگو تھے۔ ان یہودی احبار و رہبان کو صاف نظر آرہا تھا کہ جس مسلکِ حیات کی طرف خدا کا یہ اولوالعزم نبی دعوت دے رہا ہے، اس سے ان کی مذہبی سیادت اور پیشوائیت کی گدیاں ہمیشہ کے لئے چھن جائیں گی۔

مصائب و مشکلات کے اس نامساعد ماحول میں مسیح علیہ السلام کی دعوتِ انقلاب کا آغاز ہوا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ صدیوں کی تحریفات سے حضرت عیسےٰؑ کی صحیح تعلیم اناجیل سے مشکل سامنے آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس رطب و یابس میں پھولوں کی بکھری ہوئی پتیوں کی طرح کہیں کہیں اس آسمانی دعوت کی جھلک موجود ہے۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیش کی۔ پرویزؒ صاحب کے مذکورہ درس قرآنی میں انہی حسین پتیوں کو سامنے لایا گیا تھا اور اسی کو پیشِ نظر رکھ کر ہم اس انقلابی پیغام کے چند گوشے قارئین کے سامنے لا رہے ہیں جو دیگر انبیائے کرامؑ کی طرح مسیح علیہ السلام کی زبانی فردوش گوش بنا۔ چونکہ ہر نبی کی تعلیم (اپنے بنیادی مقاصد کے اعتبار سے) ملوکیت، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے استبداد اور قہرمانیوں کے خلاف کھلا چیلنج ہوتی ہے اس لئے اس پیغام میں بھی اسی اعلانِ جنگ کی صدائے بازگشت سنائی دے گی۔

ان تعلیمات سے قبل مشہور مؤرخ (CECIL ROTH) کی مشہور کتاب (A SHORT HISTORY OF THE JEWISH PEOPLE) کا یہ اقتباس سامنے لے آیئے کہ

> "(حضرت مسیح) ان لوگوں میں سے تھے جنہیں رومی ارباب حکومت نے اس جرم کی پاداش میں حوالۂ دار و رسن کر دیا کہ انہوں نے اپنی قوم کے حقوق و مفاد کی بازیابی کی جرأت کی تھی۔ حضرت یسوعؑ کے سامنے دو مقاصد تھے۔ ایک طرف آپ مسیح موعود ہونے کے مدعی تھے۔ جسے بنی اسرائیل کو غیروں کی غلامی اور محکومی سے چھڑانے کے لئے آنا تھا اور دوسرے انہیں ان اخلاقی اور معاشرتی ضوابط کی پابندی کرانی تھی جو بنی اسرائیل کے مصلحین کی نمایاں خصوصیت تھی۔" (ص ۱۴۰)

مسیح علیہ السلام کی تعلیم عاجزی اور بے چارگی اختیار کرنے کی تعلیم نہیں تھی بلکہ یہ ظلم و جبر کی مستبد قوتوں

علانِ جہاد

کے خلاف زندگی اور اس کی ہر متاعِ عزیز کی بازی لگا دینے کا اعلان تھا۔ متی کی انجیل اس دعوتِ جہاد کو یوں پیش کرتی ہے۔

یہ نہ سمجھ کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ کیونکہ میں اس لئے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے، اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں۔ اور اس آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے۔ جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔ اور جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں۔ (متی ۳۴ — ۱۰/۳۸)

رفقائے انقلاب کے نام

حضرت مسیحؑ اپنے سرفروش فدائیوں کو جب آسمانی دعوت کی اشاعت و تبلیغ کے لئے روانہ کرتے ہیں تو انہیں حسبِ ذیل ہدایات سے مستفید فرماتے ہیں،

"ان بارہ کو یسوع نے بھیجا اور انہیں حکم دے کر کہا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا اور چلتے چلتے یہ منادی کرنا کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آگئی ہے۔ بیماروں کو اچھا کرنا، مُردوں کو جلانا۔ کوڑھیوں کو پاک صاف کرنا۔ بدروحوں کو نکالنا۔ تم نے مفت پایا مفت دینا۔ نہ سونا اپنے کمربند میں رکھنا نہ چاندی نہ پیسے۔ راستے کے لئے نہ جھولی لینا۔ نہ دو دو کرتے۔ نہ جوتیاں۔ کیونکہ مزدور اپنی خوراک کا حق دار ہے۔ اور جس شہر یا گاؤں میں داخل ہونا دریافت کرنا کہ اس میں کون لائق ہے اور جب تک وہاں سے روانہ نہ ہو اسی کے ہاں رہو اور گھر میں داخل ہوتے وقت اسے دعائے خیر دو اور اگر وہ گھر لائق ہو تو تمہارا سلام اسے پہنچے اور اگر لائق نہ ہو تو تمہارا سلام تم پر پھر آئے۔ اور اگر تمہیں کوئی قبول نہ کرے اور تمہاری باتیں نہ سُنے تو اس گھر یا اس شہر سے نکلتے وقت اپنے پاؤں کی گرد جھاڑ دو۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ عدالت کے دن اس شہر کی نسبت سدوم اور عمورہ کے علاقہ کا حال زیادہ برداشت کے لائق ہوگا۔

اس کے بعد فرمایا کہ

دیکھو میں تمہیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑوں کو بھیڑیوں کے بیچ میں۔ پس سانپوں کی مانند ہوشیار اور کبوتروں کے مانند بھولے بنو۔ مگر آدمیوں سے خبردار رہو۔ کیونکہ وہ تمہیں عدالتوں کے حوالے کریں گے اور اپنے عبادت خانوں میں تمہارے کوڑے ماریں گے اور تم میرے سبب

حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کئے جاؤ گے تاکہ ان کے اور غیر قوموں کے لئے گواہی ہو۔ لیکن جب وہ تمہیں پکڑوائیں تو فکر نہ کرنا کہ ہم کس طرح کہیں اور کیا کہیں کیونکہ جو کچھ کہنا ہوگا اس گھڑی تمہیں بتایا جائے گا۔ کیونکہ بولنے والے تم نہیں بلکہ تمہارے باپ کا رُوح ہے جو تم میں بولتا ہے۔ بھائی کو بھائی قتل کے لئے حوالے کریگا اور بیٹے کو باپ بیٹے اپنے ماں باپ کے برخلاف کھڑے ہو کر انہیں مروا ڈالیں گے اور میرے نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کریں گے۔ مگر جو آخر تک برداشت کرے گا وہی نجات پائیگا۔ لیکن جب تمہیں ایک شہر میں ستائیں تو دوسرے کو بھاگ جاؤ۔ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم اسرائیل کے سب شہروں میں نہ پھر چکو گے کہ ابنِ آدم آجائے گا۔"

(متی ۱۶ ۔ ۱۰/۲۳)

یہودی پیشوائیت زلزلے میں

مذہبی اجارہ دار جو اپنی "خدائی" کی مسندیں بچھا کر، خدا اور مذہب کے نام پر، اپنی ہوسناکیوں کے لئے سامانِ تسکین پیدا کرتے ہیں کس طرح دینِ خداوندی کی آسمانی دعوت کو اپنی پیشوائیت کی مفاد پرستیوں کے لئے سامانِ موت سمجھتے ہیں۔ اس کا اندازہ یہودی علماء و شیوخ کی اس چیخ و پکار سے لگائیے جسے انجیل برنباس میں بالفاظِ ذیل پیش کیا گیا ہے۔

"تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا کہ" اگر یہ آدمی بادشاہ ہوگیا تو ہم کیا کریں گے۔ البتہ یہ ہم پر بڑی مصیبت ہوگی اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقہ کے موافق اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ ہماری تقالید (رسومات) کو باطل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا؟ یقیناً ہم اور ہماری اولاد (سب) تباہ ہو جائیں گے اس لئے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔

حالانکہ اس وقت یہ خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ایک بادشاہ اور ایک حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کوئی پرواہ کرنے والے نہیں۔ جیسے کہ ہم ان کی شریعت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے اور اسی سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں وہ کر لیں۔ پس اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا اللہ رحیم ہے قربانی اور روزہ کے ساتھ اس کا راضی بنا لینا ممکن ہے۔ مگر جب کہ یہ آدمی بادشاہ ہوگیا تو ہرگز نہ راضی بنایا جا سکے گا مگر جب کہ اللہ کی عبادت ویسے ہی ہوتے دیکھے جیسی کہ موسیٰ نے لکھی ہے۔"

(انجیل برنباس فصل صہ ۱۴۲)

علماء و مشائخ کے کردار کی ایک جھلک

یہ یہودی علماء و مشائخ کس خبثِ باطن کے مظہر اور کس پستیٔ کردار کے پیکر تھے اس کی تصویر بھی اناجیل کے اوراق میں ملے گی۔ سچ پوچھئے تو مسیح علیہ السلام کا سب سے بڑا "جرم" یہی تھا کہ انہوں نے ان احبار و رہبان کی دسیسہ کاریوں کے خلاف جو اپنے مصنوعی تقدس کے زرّیں نقاب میں نوعِ انسانی کی بدبختی کا سامان بن گئے تھے صدائے حق بلند کی تھی۔ یہ تنقید کس قدر شدت کا انداز اختیار کئے ہوئے تھی اس کا اندازہ اناجیل کے حسبِ ذیل بیانات سے بخوبی ہو سکے گا۔ سنئے! متی کی انجیل میں ہے کہ

اُس وقت یسوع نے بھیڑ سے اور اپنے شاگردوں سے یہ باتیں کہیں کہ فقیہہ اور فریسی موسےٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن ان کے سے کام نہ کرو۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں۔ مگر آپ انہیں انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کے دکھانے کو کرتے ہیں کیونکہ اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجے کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے ربی کہلانا پسند کرتے ہیں۔ مگر تم ربی نہ کہلاؤ کیونکہ تمہارا استاد ایک ہی ہے اور تم سب بھائی ہو اور زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہو۔ کیونکہ تمہارا باپ ایک ہی ہے جو آسمانی ہے اور نہ تم ہادی کہلاؤ کیونکہ تمہارا ہادی ایک ہی ہے یعنی مسیح۔ لیکن جو تم میں بڑا ہے وہ تمہارا خادم بنے اور جو کوئی اپنے آپ کو بڑا بنائے گا وہ چھوٹا کیا جائے گا اور جو اپنے آپ کو چھوٹا بنائے گا وہ بڑا کیا جائے گا۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لئے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔

اے اندھے راہ بتانے والو! تم پر افسوس ہے! جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن اگر مقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہوگا۔ اے احمقو اور اندھو۔ کونسا بڑا ہے؟ سونا یا مقدس جس نے سونے کو مقدس کیا؟ اور پھر کہتے ہو کہ اگر کوئی قربان گاہ کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں۔ لیکن جو نذر اس پر چڑھی ہو اگر اُس کی قسم کھائے تو

اس کا پابند ہوگا۔ اے اندھو! کونسی چیز بڑی ہے؟ نذر یا قربان گاہ جو نذر کو مقدس کرتی ہے
پس جو قربان گاہ کی قسم کھاتا ہے وہ اس کی اور سب چیزوں کی جو اس پر ہیں قسم کھاتا
ہے۔ اور جو مقدس کی قسم کھاتا ہے وہ اُس کی اور اس کے رہنے والے کی قسم کھاتا ہے
اور جو آسمان کی قسم کھاتا ہے وہ خدا کے تخت کی اور اُس پر بیٹھنے والے کی قسم کھاتا
ہے۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے! کہ پودینے اور سونف اور زیرے پر دہکی
دیتے ہو۔ اور تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے
لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔ اے اندھے راہ بتانے والو۔ جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور
اونٹ کو نگل جاتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے! کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو
جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں، مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے
بھری ہوئی ہیں، اس طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں
ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راستبازوں
کے مقبرے آراستہ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادوں کے زمانے میں ہوتے تو
نبیوں کے خون میں اُن کے شریک نہ ہوتے۔ اس طرح تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ ہم نبیوں
کے قاتلوں کے فرزند ہیں۔ غرض اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھردو۔ اے سانپو، اے افعی کے
بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے؟ اس لئے دیکھو۔ میں نبیوں اور داناؤں اور فقیہوں کو
تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ اُن میں سے بعض کو قتل کرو گے اور صلیب پر چڑھاؤ گے اور بعض کو
عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر شہر ستاتے پھرو گے۔ تاکہ سب راستبازوں کا خون جو
زمین پر بہایا گیا تم پر آئے۔ راستباز ہابیل کے خون سے لے کر برکیاہ کے بیٹے زکریا کے خون تک
جسے تم نے مقدس اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس
زمانے کے لوگوں پر آئے گا۔"

(متی ۱—۲۳/۳۶)

یہ ہے ایک دھندلا سا عکس اس برگزیدہ نبیؑ کی انقلابی تعلیم کا جو اپنی آسمانی دعوتِ انقلاب اور عظمتِ کردار سے بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو نجات دلانے اور مقامِ انسانیت پر فائز کرنے آیا تھا۔ لیکن ملوکیت اور پیشوائیت کی مخصوص مصلحتوں

اور مفاد پرستیوں نے ان تعلیمات کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور اپنی پُرفریب تحریفات سے اس انقلاب آفریں شخصیت کے مقام و پیام پر ایسے پردے ڈال لئے کہ اب عیسائیت اپنی مروّجہ تعلیمات کی رُو سے خانقاہ نشین زاہدوں، مسکینوں عاجزوں اور بے بسوں کا مذہب نظر آتی ہے۔ یاد رکھیئے۔ مسیح علیہ السلام کی پیغمبرانہ دعوت کے جو گوشے ہم نے ان صفحات میں پیش کئے ہیں وہ کسی ایک دَور سے وابستہ نہیں۔ ملوکیت اور سرمایہ داری اور پیشوائیت ہر دور میں اسی کردار کا مرقع نظر آئے گی جس کی تصویر ان اقتباسات میں جھلک رہی ہے۔

توجّہ طلب

مسلم کمرشل بنک کے علاوہ مجلّہ طلوعِ اسلام میں اس وقت جو اشتہارات شائع ہو رہے ہیں ان میں ایک اشتہار کا عطیہ جناب عطاء الرحمٰن ارائیں صاحب کی طرف سے ہے اور دوسرا اشتہار جناب میاں محمد اقبال سرور صاحب کا عطا فرمودہ ہے جو سالہا سال سے چھپ رہا ہے۔ یہ اور اس قسم کی دوسری عنایات جہاں مجلّہ کے لئے گراں قدر ہیں وہاں ان تمام حضرات کے لئے باعثِ تقلید بھی ہیں جو کسی طور کسی انڈسٹری سے وابستہ ہیں۔ ادارہ ایسے حضرات کی توجّہ کے ممنون ہوگا۔

ناظم ادارہ

آصف جلیل سعودی عرب

مُفت کی جنّت

پاکستان میں اخلاقی قدروں کو پامال ہوتے دیکھ کر اور اپنے ہم وطنوں کو بد دیانتی، رشوت خوری، چور بازاری، لوٹ کھسوٹ، ملاوٹ اور ذخیرہ اندوزی جیسے جرائم میں مبتلا پاکر ذہن میں یہ سوال بار بار آتا ہے کہ اگرچہ ہر مسلمان آخرت پر ایمان لانے کا دعویٰ کرتا ہے اور تمام اعمال کے حساب کتاب پر اس کا یقین ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں جرائم روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ نماز روزے کے پابند حضرات بھی اس طرح کے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس سوال کے تمام ممکنہ جوابات ایک ہی نقطہ پر آکر مرکوز ہوتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہمارے مذہبی رہنماؤں کے پیش کردہ عقائد کی وجہ سے ہے جن کی اسناد کچھ بھی ہوں لیکن اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ یہ عقائد قرآنِ کریم میں مذکورہ اصولوں سے متصادم ہیں۔ اس طرح کے اُلجھاؤ پیدا کرنے سے ہی مُلّائیت کا کاروبار چمکتا ہے۔ ان کی نفسیات کی صحیح عکاسی قرآنِ کریم نے اس طرح کی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۗ

(۹/۳۴)

"اے ایمان لانے والو! بہت سے علماء اور مذہبی پیشوا لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں"۔

مسجدوں اور مذہبی اجتماعات سے اُٹھنے والی صداؤں، مذہبی جرائد اور مجلات میں چھپنے والی تحریروں اور سرکاری ذرائع ابلاغ سے نشر ہونے والی دینی تقاریر میں اس نظریے کا بڑے وسیع پیمانے پر پرچار ہوتا ہے کہ جنت اور مسلمان (چاہے وہ کیسا بھی ہو) لازم و ملزوم ہیں۔ اس طرح مجرموں کی بالواسطہ طور پر اور غیر محسوس طریقے سے حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ آیئے ہم اس بارے میں مروجہ عقائد کا قرآنِ کریم کی روشنی میں جائزہ لیں جو ہر مسلمان کی رگوں میں خون بن کر

دوڑ رہے ہیں اور جنہیں مسلّمہ حقائق کا درجہ حاصل ہے۔

۱۔ ہر کلمہ گو ضرور جنّت میں جائے گا۔ اگر اس نے بہت زیادہ گناہوں کا ارتکاب کیا ہوگا تو اسے تھوڑے عرصے کے لئے دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ پھر وہاں سے نکال کر اُسے حوضِ کوثر میں ڈبو کر نکالنے کے بعد جنّت میں داخل کر دیا جائے گا۔ یہودی بھی اس طرح کی خوش فہمیوں میں مبتلا تھے لیکن قرآن نے نہ صرف ان کی بلکہ تمام نہاد مسلمانوں کی اس غلط فہمی کا ازالہ اس طرح کر دیا ہے:۔

وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۲/۸۰)

"اور یہ کہتے ہیں کہ ہمیں چند روز کے لئے آگ چھوئے گی۔ کہو کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے رکھا ہے؟ اگر ایسا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے وعدے سے نہیں پھرتا۔ یا تم اللہ تعالیٰ سے ایسی باتیں منسوب کر رہے ہو جن کا تمہیں علم نہیں"۔

اور جنّت کے لوگ کہیں گے کہ

فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ۝ (۵۲/۲۷)

"اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان کیا اور ہمیں زہریلے عذاب سے دُور رکھا"۔

۲۔ یہ بات تو ہر دم ہر مسلمان کی زبان پر ہوتی ہے کہ اللہ معاف کرے گا: اس کی تائید میں اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ جیسی آیات پیش کی جاتی ہیں، ان سے معافی کا تصور قائم کرنا عربی زبان سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اگر یہ تصور ہو کہ اِدھر غلطی اُدھر "یا اللہ معاف کرنا" کہہ دیا تو اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے، تو پھر ہر رشوت خور رشوت کا مال جیب میں ڈال کر معافی مانگتا جائے گا، ملاوٹ کرنے والا ملاوٹ کے ساتھ ساتھ توبہ استغفار کا ورد بھی کرتا رہے گا۔ ایسے میں معاشرے کی اصلاح کیونکر ممکن ہوگی۔ معاف کر دینے کا تصور اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا نقیض ہے۔ عدل میں معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غَفُوْرٌ کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے قانون میں حفاظت کا سامان موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو یہ موقع دیتا ہے کہ اگر اس سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو تو اس کا ازالہ کر سکے۔ جیسے کوئی زخم لگنے کے بعد کچھ عرصہ بعد مندمل ہو جاتا ہے یا کوئی ٹوٹ پھوٹ ہو جائے، تو اس کی مرمت ہو سکے۔ اسی لئے تَابَ کے ساتھ اَصْلَحَ کا لفظ بھی آتا ہے۔ اور میزان قائم کرنے کے حوالے سے قرآنِ کریم نے ایک سنہری اصول دیا ہے کہ اگر ایک پلڑا گناہ کے وزن سے جھک گیا ہے، تو دوسرے میں عملِ صالح ڈال دیں تاکہ یہ پلڑا جھک جائے۔

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ (۱۱/۱۱۴)

"حسنات ازالہ کرتی ہیں سیّئات کا"

۳۔ ایک اور نظریہ، جو جنت کے چور دروازے کی راہ دکھاتا ہے وہ یہ ہے کہ قیامت کے روز نبیٔ کریمؐ اللہ تعالےٰ سے اپنی اُمّت کی سفارش کریں گے کہ وہ انہیں جنت میں داخل کر دے۔ جس عمل کو دنیا میں معیوب سمجھا جاتا ہے، اسے قیامت کے روز کے حوالے سے رسولؐ اللہ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ (نعوذ باللہ)۔ اس نظریے کی تائید میں ان آیات کا حوالہ دیا جاتا ہے جن میں "شفاعت" کا لفظ آیا ہے اور عام طور پر اس کا ترجمہ سفارش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآنِ کریم میں اَلشَّفْعِ وَ الْوَتْرِ کا ذکر ہے جس کے معنی جفت اور طاق ہیں۔ اس لحاظ سے شفاعت کے معنی ہوں گے کسی کی ہاں میں ہاں ملانا، تائید کرنا (SECOND کرنا)۔ اور ظاہر ہے کہ رسولؐ اللہ صرف اسی شخص کی تائید کریں گے جو حق پر ہوگا اور جس نے اعمالِ صالحہ کئے ہوں گے۔ البتہ آجکل کے مسلمانوں کی شکایت اس طرح کریں گے،

يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ○ (۲۵/۳۰)

یارب! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔

۴۔ جنت کی رسائی کے لئے مولوی صاحب ایک اور راستہ بتاتے ہیں۔ اگر کسی نے زندگی میں کوئی عملِ صالح نہیں کیا، تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ مرنے کے بعد اس کے لواحقین قرآن خوانی کے ذریعے اس کے اعمال نامے میں نیکیوں کا اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اس کی مثال اس طرح ہے جیسے کسی نالائق طالب علم کو یہ یقین دہانی کرائی جائے کہ کمرۂ امتحانات سے نکلنے کے بعد سے لے کر نتیجہ نکلنے تک نمبروں کے اضافے کے امکانات موجود ہیں۔ تو صاف ظاہر ہے کہ وہ محنت کرنے کی بجائے ایسے ذرائع استعمال میں لائے گا جن سے اس کے نمبروں میں اضافہ ہو سکے۔ اس نظریے کی عملی تطبیق میں مولوی صاحب کا بھی بھلا ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن خوانی اور ایصالِ ثواب کے لئے انہیں ہی زحمت دی جاتی ہے۔ آجکل آپ کی آسانی اور اپنے پاپی پیٹ کی خاطر کچھ مولوی صاحبان نے اپنے شاگردوں سے پیشگی قرآن ختم کرا رکھے ہیں۔ آپ ہدیہ پیش کر کے پڑھے پڑھائے قرآنِ کریم کا ثواب مرحومین کو پہنچا سکتے ہیں۔ بعد از موت نیکیاں حاصل کرنے کے لئے، صدقہ جاریہ، مسجد کی تعمیر اور حج بدل جیسی سہولتیں موجود ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم نے ایسے تمام ذرائع پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا ہے کہ جو کچھ کرنا ہے مرنے سے پہلے کر لو۔

وَ اَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ
فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ

وَ اَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (۶۳/۱۰)

"اور جو رزق ہم نے تمہیں عطا کیا ہے اسے (دوسروں کے لئے) کھلا رکھو۔ قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے تو وہ کہے کہ اے میرے ربّ! اگر تو مجھے کچھ اور مہلت دے تو میں اپنی سچائی ثابت کر سکوں اور صالحین میں سے ہو جاؤں۔"

اور اگلی آیت میں اللہ تعالےٰ نے واضح کر دیا ہے کہ وہ کسی کو مزید مہلت نہیں دیتا۔

۵۔ محض چند الفاظ دہرا دینے سے لاکھوں نیکیاں مل جاتی ہیں اور لاکھوں گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "جو شخص بازار میں داخل ہوا اور اس نے کہا: (لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَ لَهُ الْحَمْدُ يُحْيِيْ وَ يُمِيْتُ وَ هُوَ حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ) تو اللہ تعالےٰ اس کے نام دس لاکھ نیکیاں لکھ دیتا ہے اور دس لاکھ گناہ معاف کر دیتا ہے۔"

ایک اور روایت کے مطابق رسول اللہؐ نے فرمایا: "استغفار کی بہترین دعا یہ ہے کہ (اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّيْ لَا اِلٰهَ اَنْتَ خَلَقْتَنِيْ وَ اَنَا عَبْدُكَ وَ اَنَا عَلٰى عَهْدِكَ وَ وَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ اَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ وَ اَبُوْءُ بِذَنْبِيْ فَاغْفِرْلِيْ اِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ) جس نے اس پر یقین رکھتے ہوئے اسے دن کے وقت پڑھا اور وہ رات ہونے سے پہلے مر گیا، تو وہ اہلِ جنت میں سے ہے اور جس نے اس پر یقین رکھتے ہوئے رات کے وقت پڑھا اور صبح ہونے سے پہلے مر گیا تو وہ اہلِ جنت میں سے ہے۔"

قرآنِ کریم میں محض الفاظ ادا کرنے سے نیکیوں کے حصول کی کوئی دلیل نہیں ملتی۔ اس لئے مذکورہ بالا روایتیں وضعی ہیں اور انہیں رسول اللہؐ سے منسوب کرنا صحیح نہیں۔

آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ مذہبی رہنماؤں نے جنت کے حصول کے لئے جو آسان ذرائع طے کر رکھے ہیں، وہ خلافِ قرآن ہیں۔ لیکن عام آدمی اس حقیقت سے بے خبر ہے اور بلا سمجھے سوچے مولوی صاحب کی پیدا کردہ غلط فہمی کی بنا پر جرائم کرتا چلا جا رہا ہے اور اپنے طور پر مطمئن ہوتا ہے کہ وہ جنت ہی کا حقدار ہے۔ قرآنِ کریم میں واضح طور پر ذکر ہے کہ جنت کا حصول اتنا آسان نہیں ہے:۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ

اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝ (۲/۲۱۴)

کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تم ان جاں گداز مراحل سے گذرے ہی نہیں جن سے تم سے پہلے گذرنے والے لوگ دوچار ہوئے تھے۔ ان کی حالت یہ تھی کہ انہیں سختیوں اور مصیبتوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ان کی شدت سے ان کے دل دہل جاتے۔ یہاں تک کہ وہ اور ان کا رسول پکار اٹھتے کہ بارِ الٰہا! ہماری کوششوں کے بارآور ہونے کا وقت کب آئے گا۔ تب تائیدِ خداوندی ان کی سعی و عمل کو ثمر بار کرتی۔"

ہر مسلمان کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ ہر عمل، چاہے وہ اچھا ہو یا بُرا، اسی مناسبت سے اس کی ذات پر مثبت یا منفی اثر مرتب کئے چلا جاتا ہے۔ اپنے اعمال نامے میں گناہوں کے اضافے سے بچنے کے لئے اپنے ہر عمل کو قرآن کریم کی روشنی میں پرکھ لینا چاہیئے کیونکہ وہی عمل صالح کسی کے میزان میں وزن رکھتا ہے جو قرآن کریم کی رُو سے صحیح ہو۔ انسانی اعمال کا سلسلہ اس کے سانس بند ہونے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ جنت صرف اعمالِ صالحہ کے نتیجہ کے طور پر ملے گی۔ نہ اس کا کوئی چور دروازہ ہے اور نہ ہی وہ مُفت میں ملے گی۔

علی محمد چدھڑ

اخبارات کے اسلامی صفحات

۹۲ ستمبر ۱۹۹۲ء کے روزنامہ 'جنگ' میں باہر کے رنگین صفحہ پر حضرت بابا شاہ جمالؒ قادری سہروردی کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ صاحبِ کمال اور صاحبِ کرامت بزرگ تھے۔ اُن کا شجرہ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ سے جا کر ملتا ہے۔ اتنا کچھ تحریر کرنے کے بعد باباجی کی کچھ کرامات بیان کی گئی ہیں۔ فیچر کے آخر میں ایک اپیل بھی درج ہے جس کا اقتباس یہ ہے۔ "ہمارے ہاں شرح خواندگی کم ہے۔ لہٰذا حکومتی سطح پر اور علمائے کرام کا بھی فرض ہے کہ وہ اولیائے کرام کی تعلیمات عام کرنے میں اپنا کردار ادا کریں اور لوگوں کے ذہنوں میں مزارات مبارک کا احترام برقرار رکھنے کے لئے اقدام کریں اور انہیں آداب سکھائیں۔ اس وقت عموماً میلوں اور عرسوں میں بعض اوقات جو ناخوشگوار سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں، ان سے لوگوں کو منع کیا جائے کہ عرس کی تقریبات منانے کا مقصد تفریح نہیں بلکہ تعلیماتِ اسلام کو عام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

قارئین کرام! آپ بازار سے بسکٹوں کا ایک اعلیٰ اور خوبصورت پیکٹ خریدتے ہیں۔ لیکن بوقت ضرورت جب اسے کھولتے ہیں تو بسکٹوں کی بجائے ٹافیاں نکل آتی ہیں۔ یقیناً آپ کو اس وقت حیرانی کے ساتھ مایوسی بھی ہوگی۔ اسی طرح فرض کریں آپ چاولوں کی ایک بہت ہی اعلیٰ قسم نہایت ہی دلکش اور رنگین پیکنگ میں خرید لیتے ہیں۔ جس پر کمپنی کی طرف سے بہترین کوالٹی کی مہر بھی موجود ہے۔ لیکن گھر آ کر آپ چاولوں کا تھیلا کھولتے ہیں تو اس میں سے ڈٹا نکل آتا ہے، تو اس وقت بھی آپ کمپنی کو کوستے ہوئے سر پیٹ کر رہ جائیں گے۔ یہی حال روزنامہ جنگ کے اسلامی صفحہ کا ہے۔ جس کے شروع میں موٹے حروف کے ساتھ اقراء اور اسلامی صفحہ کے الفاظ نہایت ہی نمایاں کر کے لکھے گئے ہیں۔ اس کے بعد ایک قرآنی آیت مہر کی شکل میں بڑے خوبصورت انداز میں پیش کی گئی ہے کہ شاید اس طرح اسلام اور قرآن کی شہادت سے فیچر کے متن کو دینی لحاظ سے درست ثابت کیا جا سکے، باوجود اس کے کہ سارے متن میں قرآن اسلام والی بات سوائے کرامات کے نظر ہی نہیں آئی۔

اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شاید تبلیغِ اسلام کے لئے کرامات ہی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا ہو۔ عام مسلمانوں میں بھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تبلیغِ اسلام کے لئے خدا نے بزرگانِ دین کو اپنی کرامات دکھانے کی طاقت بخشی جنہیں دیکھ کر غیر مسلم غول کے غول حلقۂ اسلام میں شامل ہوتے گئے۔ اِس قسم کا تأثر درست نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ایسے خارق عادات اور محیّر العقول واقعات کا وقوع پذیر ہونا اسلام میں بزرگی کی علامت نہیں۔ وہ تو ہندوؤں کے سادھو سنیاسیوں سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ایسے عجیب و غریب ناممکن العمل واقعات کو دیکھ کر ایمان لانے کو اسلام ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کہتا ہے کہ ہمیشہ صاحبانِ عقل و بصیرت، غور و فکر کے بعد اپنے دل کی گہرائیوں سے دلیل و برہان کے ساتھ، پوری طرح قائل ہو کر، ایمان لاتے ہیں۔ خداوند کریم مومنین کی خصوصیت یہ بتاتے ہیں کہ "اور تو اور جب ان کے سامنے خدا کی آیات بھی پیش کی جاتی ہیں، تو وہ ان کے سامنے بھی اندھے بہرے بن کر نہیں جھک پڑتے۔" (۲۵/۷۳)۔

جہاں تک تبلیغِ اسلام کا تعلق ہے تو یہاں رسمی مسلمانوں کی لامحدود عددی نفری کو اتنی فوقیت حاصل نہیں۔ اصل اہمیت کی حامل بات یہ ہے کہ کون سا اسلام پیش کیا جاتا ہے۔ اگر وہ صدرِ اوّل کا دین ہے تو ہزاروں کی اقلیت بھی لاکھوں کی اکثریت پر حاوی ہوگی اور اگر آمریت کے دَور کا فقہی مذہب ہے تو پھر کروڑوں کی تعداد بھی چند لاکھ یہودیوں سے مغلوب ہو جائے گی۔

جہاں تک مذکورہ قرآنی آیت کا تعلق ہے تو یہ سورۃ الرّحمٰن کی نانویں آیت ہے۔ جس کا مختصر مفہوم یہ ہے کہ انسانی پرورش کے لئے قرآن جس توازن کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ تم اس توازن کو عدل و انصاف کے ساتھ قائم رکھو اور کسی کے حقوق و فرائض میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ کرو۔ اب ایک اور صورت پیدا ہو گئی کہ مذکورہ آیت کے مفہوم کا فیچر کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ بلکہ اس کے اُلٹ معلوم ہوتا ہے۔ جیسے 'قُمر' کے لیبل کیساتھ افیم پیش کر دی جائے۔ لہٰذا آیت کا اندراج یہاں تبرک کے طور پر کیا گیا ہے۔ تاکہ فیچر میں کچھ تقدیس کا رنگ لا کر اسے اور بھی پرکشش بنایا جائے۔ دیکھئے ایک چیز ہے عقیدت جو عقل و فکر کی رو سے نہیں بلکہ دیکھا دیکھی جذبات اور اندھی تقلید کی بنا پر کی جاتی ہے۔ لہٰذا افسوسناک ہے۔ لیکن جب اس عقیدت کا اظہار کسی شخصیت کے متعلق کیا جائے تو یہ عمل اور بھی مذموم قرار پاتا ہے کیونکہ یہ حرکت

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ

کی ایک مستقل قدر کے خلاف چلی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بار بار غور و فکر کی تاکید کرتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ آپ قرآنی آیات کو بھی سوچے سمجھے بغیر تسلیم نہ کریں۔

خیر یہ تو تھی عقیدت کی بات۔ چونکہ اس کا معاملہ ذرا نازک ہوتا ہے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ اس سے ہٹ کر پہلے کرامات

میں دیئے گئے کچھ واقعات کا ذکر ہو جائے۔ اگر آپ دمدمہ کی سات منزلہ عمارت کو سامنے رکھیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ یہ دنوں یا مہینوں کا کام نہیں تھا۔ ایسا کام جس کے متعلق پہلے ہی مشہور ہو کہ اس پر صرف رات کے وقت چراغوں کی روشنی میں کام ہوا، مدت کے معاملہ میں اور بھی طول پکڑ سکتا ہے۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ ان چراغوں میں تیل جلتا تھا یا پانی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اکبر بادشاہ کی بیٹی نے جس کا محل دمدمہ کے بالکل متصل تھا۔ دمدمہ کی اونچائی کے متعلق شروع ہی میں کیوں نہ اعتراض کیا اور وہ اتنی مدت تک کیوں خاموش رہی۔ جوں ہی تین چار نہیں جب پوری سات منزلیں مکمل ہو گئیں، شہزادی نے دمدمہ کو گرانے کا حکم دے دیا۔ واقعاتی لحاظ سے یہ درست معلوم نہیں ہوتا۔

اسی کرامت کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ عموماً اللہ والے لوگوں کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ وہ بادشاہوں اور راجوں مہاراجوں کے احکام کی کوئی خاص پرواہ نہیں کرتے۔ لیکن اس معاملہ میں باباجیؒ فوراً تعمیل پر تیار ہو گئے اور انہوں نے رات کے وقت دمدمہ کی اونچائی کم کرنے کے لئے دھمال شروع کر دیا۔ جس کی شدت اور دھمک کا یہ حال تھا کہ ایک ہی رات میں عمارت کی پانچ منزلیں زمین کے اندر دھنس گئیں۔

۲۔ باباجیؒ کی دُعا سے ہندو کھتری کے ہاں یکے بعد دیگرے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ بقول راوی وہ بڑا خوش ہوا اور حضرت کا اور زیادہ عقیدت مند ہو گیا۔ لیکن اتنا کچھ لینے اور دیکھنے کے باوجود شریف آدمی کافر کا کافر ہی رہا۔ نہ صرف یہ کہ اس کا دوسرا بیٹا بھی ایمان نہ لایا اور یوں، دونوں باپ بیٹا اسلام سے محروم ہی رہ گئے۔

۳۔ باباجیؒ نے اپنے آخری وقت میں حجرے سے اپنے خادموں کو آواز دی کہ میرا آخری وقت آگیا ہے۔ حجرے کا دروازہ باہر سے بند کر دو اور اس کے اندر نہ آنا۔ انہوں نے ایک تعمیل تو کر دی لیکن اس کے بعد باباجیؒ کی سخت ممانعت کے باوجود دروازہ کھول کر اندر آ گئے اور اس طرح وہ باباجیؒ کے حکم کی نافرمانی کے مرتکب ہوئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کسی نے باباجیؒ کی نمازِ جنازہ نہ پڑھائی اور نہ خود انہیں اپنے ہاتھ سے دفن کیا۔ لہٰذا موجودہ مقبرہ کی بنیاد محض خواب میں ایک اشارہ پر بنتی ہے جو یقینی نہیں ہے۔ اگر عقیدت اور بے جواز شخصیت پرستی کو بالائے طاق رکھ دیا جائے تو سلسلہ سہروردیہ کی خود اپنی شہادت کے مطابق باباشاہ جمالؒ کا موجودہ مقبرہ مشکوک ہو جاتا ہے۔

جہاں تک ملکِ عزیز میں شرح خواندگی بڑھانے کا تعلق ہے تو یہ ایک الگ اور وسیع موضوع ہے۔ یہ چند سطور اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔ البتہ ہمارے قدامت پرست اور تقلید زدہ مذہبی راہ نماؤں نے علم کو جو تصوف کے پُرپیچ گورکھ دھندوں اور مروجہ دارالعلوم کی تاویلوں میں مقید کر رکھا ہے، درست نہیں ہے۔ ان کی نظروں میں دینی اور دنیاوی علم کی دو مختلف اقسام ہیں۔ دنیاوی تعلیم تو ان کے فتویٰ کے مطابق ویسے ہی معیوب ہے اور دینی تعلیم پر وہ خود مسلط ہیں۔ قرآن کی رُو سے ایسے مذہبی راہ نما علماء کہلانے کے حقدار ہی نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو لوگ کائنات

کے مختلف گوشوں، فطرت کے لاتعداد شعبوں اور سائنس کے مختلف علوم مثلاً طبیعات، نباتات، حیوانات، کائنات طبقات الارض اور عالمِ انسانیت پر دسترس رکھتے ہیں. علماء کا لفظ خدائی نشانیوں پر غور و فکر کرنے والے ایسے حضرات پر ہی استعمال ہو سکتا ہے. دورِ حاضر کی اصطلاح میں انہی حضرات کو سائنٹسٹ اور کائناتی مفکر کہا جاتا ہے. (۲۸ ـــ ۲۷/۳۵)۔ مطلب یہ ہوا کہ سائنسی علوم کے ذریعہ کائناتی قوتوں کو مسخر کر کے اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا ہی اسلام ہے. اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں قرآن کی زبان میں وہ مومنین کہلاتے ہیں. اس کے برعکس وہ لوگ جو دنیا اور فطرت کی قوتوں کو قابلِ نفرت سمجھ کر دُور بھاگتے ہیں وہ اہلِ تصوف ہیں. جو دنیاوی مفاد اور آخرت کی خوشگواریوں دونوں سے محروم رہ جاتے ہیں. ان تصریحات کی روشنی میں معلوم نہیں، فاضل مضمون نگار کونسی تعلیم کے ذریعہ شرح خواندگی بڑھانا چاہتے ہیں. اگر ان کی مراد موجودہ دارالعلوم سے ہے تو پھر معاف کرنا' بچوں کو یہاں داخل کرانے سے بہتر ہے کہ انہیں کسی کیمپ جیل میں بھیج دیا جائے. یہ میری رائے نہیں بلکہ پنجاب کے سب سے بڑے حاکم گورنر پنجاب کے الفاظ ہیں. جو انہوں نے پچھلے دنوں چند علماء سے مخاطب ہو کر کہے تھے. باقی رہے اولیائے کرام اور ان کی تعلیم، تو اولیاء اللہ مومنین اور متقین ہی کا دوسرا نام ہے (۱۰/۶۳). یہ کوئی الگ گروہ نہیں ہے اور نہ ان کی تعلیم قرآن اور حضورؐ کے اسوہ حسنہ سے باہر ہے. یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

> "جب ہم انہیں دنیا میں حکومت عطا کرتے ہیں تو یہ نظامِ صلوٰۃ اور زکوٰۃ قائم کرتے ہیں. ایسے لوگ وہ ہیں جنہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن. انہیں دنیا اور اُخروی زندگی میں خوشگواریاں نصیب ہوتی ہیں اور یہ بہت بڑی کامیابی و کامرانی ہے." (۱۰/۶۴)

خدا کرے فاضل مضمون نگار بھی ایسا ہی سمجھتے ہوں. لیکن خدانخواستہ اگر ان کی مراد ان تارک الدنیا لوگوں سے ہے جو کمبل گدڑی اوڑھے ہمیں ادھر اُدھر پھرتے نظر آتے ہیں تو پھر وہ براہِ مہربانی اپنے مسلک پر نظرِ ثانی فرمائیں. ایسے حضرات کی تعلیم موجودہ دور میں ملکی حالات و مقاصد سے مطابقت نہیں رکھ سکتی.

فاضل مضمون نگار کا ایک گلہ اور ہے کہ مزارات کا ادب و احترام نہیں کیا جاتا، بالکل درست فرمایا. اس میں کوتاہی ہرگز نہیں ہونی چاہیئے. لیکن احترام اور شخصیت پرستی یا مزارات کے ادب اور قبر پرستی میں فرق ہے. ہماری عقیدت میں جب مبالغہ آرائی ہو تو ہم ادب و احترام کی حدیں عبور کر کے شخصیت پرستی اور قبر پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں اور پھر انسانی تکریم کی انسان ہی کے ہاتھوں وہ مٹی پلید ہوتی ہے کہ شیطان بھی کانپ اٹھتا ہے. دوسرے انہیں یہ شکایت ہے کہ میلوں اور عرسوں پر بعض ناخوشگوار سرگرمیاں کیوں ہوتی ہیں، تو جہاں تک عرسوں کا تعلق ہے. صوفیا کرام کی وفات کو وصال اور اس کی تقریب کو عرس کہا جاتا ہے. مدفون حضرات کے متعلق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وہ زندہ ہیں. اپنے سائلوں کی دعائیں سنتے ہیں اور ان کی مرادیں پوری کرتے ہیں. عرس پر عقیدت مند ایصالِ ثواب بھی کرتے ہیں اور

نذر نذرانے دیکر خود بھی منہ مانگی مرادیں پاتے ہیں۔ یہ تو ہے عقیدت۔ لیکن حقیقت کیا ہے، تو اس کے متعلق گذارش ہے کہ یہ تمام عقائد ہمارے خود ساختہ ہیں اور ان میں بال برابر بھی سچائی نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "یہ لوگ خدا کے سوا جنہیں پکارتے ہیں وہ ذرا برابر بھی اختیار و اقتدار نہیں رکھتے" (۳۵/۱۳)۔ ایک اور جگہ فرمایا۔

"حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کو قطعاً علم نہیں ہوتا کہ کون پکار رہا ہے اور وہ کیا مانگ رہا ہے" (۴۶/۵)۔ "یہاں تک کہ انہیں خود اپنے متعلق بھی اس کا علم نہیں ہوتا کہ کب اٹھائے جائیں گے" (۱۶/۲۱)۔

جہاں تک ایصالِ ثواب کے عقیدے کا تعلق ہے تو یہ بھی غیر قرآنی ہے۔ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے ہر فرد کو اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ ملتا ہے۔ کسی دوسرے کے عمل کا نتیجہ اس کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ کسی ورزش اور سیر کرنے والے کی صحت کو جو فائدہ پہنچتا ہے۔ وہ کسی بستر پر پڑے اس کے بھائی کی صحت کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا، اگر آپ ایک عمل خلافِ قرآن، خلافِ اسلام اور خلافِ عقل و قیاس کریں گے تو اس کا نتیجہ ناخوشگوار سرگرمیوں کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اگر حقیقتِ حال یہ ہے تو پھر یہ ایصالِ ثواب، نذر نیاز اور عرس عروس کیا ہے؟ جواباً عرض ہے کہ یہ سب ہماری اندھی عقیدت کا فریبِ نظر ہے۔ دنیا کو اپنے خود ساختہ عقائد کے جال میں پھنسانے کی ایک چال ہے۔ مفلس و نادار عقیدت مندوں کے دل و دماغ ماؤف کرنے کا ایک ڈھنگ ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہ بے بس اور قلاّش لوگ اب بھی نہیں سمجھتے کہ وہ اپنے ہی حاجت رواؤں کے ہاتھوں لٹ رہے ہیں۔ خوش فہمی اور سادہ دلی کی انتہا دیکھئے کہ ہم ایسے اجتماعات میں شمولیت کو ایک سعادت اور عبادت خیال کرتے ہیں۔ وہاں اپنی حاضری ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں حالانکہ ظلم و بربریت کی لاتعداد داستانیں جو ہماری معاشرتی زندگی میں موجود ہیں ان کے سوتے اسی خانقاہی نظام سے ہی پھوٹتے ہیں۔ موقع کی مناسبت سے اسی سلسلہ کی ایک خبر روزنامہ پاکستان، مورخہ ۶/۱۱/۹۲ کے ٹائٹل پیج پر ملاحظہ فرمائیں۔ بہاولپور سے ۵ میل دور خانقاہ شریف میں خواجہ محکم الدین میرانی کے سالانہ عرس پر" عرس میں آنے والی یونیورسٹی کی دو خوبصورت طالبات سجادہ نشین کے بیٹے نے اغوا کر لیں۔ لڑکیاں واپس جا رہی تھیں کہ ملزم نے ساتھیوں کی مدد سے انہیں ویگن سے اتار کر اپنی کار میں ڈالا۔ کسی زائر نے مزاحمت اور لڑکیوں کی مدد نہیں کی۔ ملزموں کی تلاش میں بہاولپور پولیس کے چھاپے، خانقاہ شریف میں چھاپا۔ سجادہ نشین منشیات فروشی کے الزام میں گرفتار۔ ڈیرے پر موجود زائرین پر لاٹھی چارج"۔

اس خبر پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں اور نہ یہ خبر نئی اور انوکھی ہے۔ اخبارات کے ذریعہ اسی قسم کی نت نئی خبریں سننا ہمارا معمول بن چکا ہے۔ یہاں کسی خاص فرد یا جگہ کا سوال نہیں۔ ہم ایک استحصالی نظام کے بدلنے کی بات کر رہے ہیں۔ قابلِ غور سوال یہ بھی ہے کہ جس سسٹم کے تحت یہ سب کچھ ہو رہا ہے، اسے ہم کب تک مقدس سمجھ کر اسلام کے نام

سے پکارتے رہیں گے۔

اور آخر میں روزنامہ جنگ کے شعبۂ اسلامی کے بااختیار ارباب سے ایک مخلصانہ گذارش۔ اشاعت کے لحاظ سے آپ کا روزنامہ سب سے بڑا قومی پرچہ ہے۔ پاکستان جیسی مملکت کے مقاصد سے آپ اچھی طرح آگاہ ہیں۔ یہ ہماری نااہلی اور بدبختی ہے کہ ہم ان مقاصد سے نصف صدی قبل کے مقابلہ میں اور بھی زیادہ دور ہو چکے ہیں۔ اس مملکت کے متعلق اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے خیالات اور عزائم سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ اسلام کے ان دو عظیم راہنماؤں کی خواہشات کے برعکس آجکل یہاں سیکولرزم اور تھیاکریسی کا دَور دَورہ ہے۔ دینی اور سیاسی لحاظ سے آپ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ آپ کے اداریئے بےلوث اور جاندار ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حمید نظامی کا دور پلٹ آیا ہے۔ ان تمام حقائق کو اپنے دل کی گہرائیوں سے تسلیم کرنے کے بعد مؤرخہ ۲۹/۹/۹۲ کو شائع ہونے والے آپ کے اسلامی صفحہ کے متعلق تھوڑی سی وضاحت چاہتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مزار مبارک کے بیرونی اور اندرونی حصّے کو مختلف خوش نما رنگوں میں نہایت ہی دل آویز طریقہ سے مزیّن کیا گیا ہے۔ اسلامی صفحہ کی گیٹ اپ بھی ہر لحاظ سے لائق تحسین ہے۔ لیکن فیچر کے متن میں باباجیؒ کی کرامات کے سوا اور چیز نظر نہیں آتی۔ کرامات کی نوعیت کیا ہے اس پر میں پہلے ہی تبصرہ کر چکا ہوں۔ قرآنی آیت جو اسلامی صفحہ پر کوٹ (QUOTE) کی گئی ہے اس کا مفہوم دوبارہ سُن لیں کہ قرآن جس توازن کی ضرورت پر زور دیتا ہے تم اس توازن کو عدل وانصاف کے ساتھ قائم رکھو۔ ان تمام حقائق دلوازمات کو یکجا کرتے ہوئے اسلام اور قرآن کے حوالہ اور مذکورہ آیت کی روشنی میں کیا آپ بےدھڑک ہوکر کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے ایسا صفحہ شائع کر کے واقعی عدل وانصاف کو قائم رکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ ایسا دعویٰ نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ یہاں اسلام اور قرآن کی بات ہو رہی ہے۔ کسی کے ذاتی معاملہ، عقیدہ یا انا کا سوال نہیں۔ فرض کیا کسی ترقّی یافتہ ملک کا ایک غیر مسلم سکالر آپ کے صفحہ کو اسلامی خیال کر کے پڑھتا ہے، تو وہ ہمارے متعلق کیا تاثرات قائم کرے گا۔ یہی ناکہ مسلمانوں کے بزرگ اپنے دھمال اور رقص سے پانچ پانچ منزلہ عمارتیں ایک ہی رات میں زمین کے اندر دھنسا دیتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے ہندوؤں کے سنیاسی اور بھادیو ایک پھونک مار کر سارے جنگل کو آگ لگادیتے ہیں۔ دوسرے اگر وہی غیر مسلم شاہ جمالؒ کے مزار کی کرامت کے متعلق پڑھے گا تو وہ ہمارے تمام اولیا کرام کے مزارات کے متعلق یہی نتیجہ اخذ کرے گا کہ دراصل یہاں مدفون کوئی بھی نہیں ہوتا۔ یونہی خواب میں اشارہ پاکر مزار بنادیئے جاتے ہیں۔ خیر یہ تو درمیان میں ایک ضمنی سی بات آگئی۔ اصل سوال یہ ہے کہ آپ اس قسم کی تبلیغ کر کے دینی نقطۂ نظر سے امتِ مسلمہ کو کیا دینا چاہتے ہیں۔ اگر اس کا جواب تصوّف یا خانقاہی نظام ہے، تو پھر گلہ شکوہ کی کوئی بات نہیں۔ نود یا بدیر۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ ہماری حالت خود بخود بقول شاعر یہ ہوجائے گی کہ

تھے ہم پوست پٹھان کے دل کے دل دیں موڑ ‌ ‌ ‌ ‌ شرن پڑے رگناتھ کے سکیں نہ تنکا توڑ

ثریا عندلیب

قرآنِ کریم کی روشنی میں زندگی

۱۔ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔

۲۔ انسان کا اصل مسئلہ صرف اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کا نہیں بلکہ ایسی زندگی بسر کرنے کا جو آگے چلنے کے قابل ہو جائے۔

۳۔ زندگی کے جن اعمال کے زندہ اور مثبت نتائج ہمارے سامنے آجائیں جس سے ہماری دنیا و آخرت کا بھلا ہو اسے ثواب کہتے ہیں۔

۴۔ زندگی کا ہر باب اور حیات کا ہر گوشہ سرگرمیٔ عمل کے بغیر ناتمام ہے۔ یہی بقائے حیات کا راز ہے۔

۵۔ سلسلۂ ارتقاء کی رُو سے یہ زندگی جو کروڑ در کروڑ مراحل طے کر کے ذاتِ انسانی تک پہنچی ہے۔ اس لئے نہیں پہنچی کہ یہ سب کچھ ہونے کے بعد یہاں پہنچ کر یہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے۔

۶۔ زندگی کے دشوار گزار راستے عورت مرد کی رفاقت کے بغیر طے نہیں ہو سکتے۔

۷۔ وقت کا زیاں زندگی کا بدترین نقصان ہے۔

۸۔ زندگی اُس کو مل سکتی ہے جو دوسروں کے لئے سامانِ زندگی مہیا کرنے کی سعی کرے۔

۹۔ انسانی زندگی کا منتہیٰ و مقصود یہ ہے کہ اجتماعی طور پر نظامِ ربوبیت کا قیام ہو جائے اور انفرادی طور پر ہر فرد کی ذات میں صفاتِ خداوندی کی نمود علیٰ حدِ بشریت ہوتی جائے اور زندگی کے ہر معاملے کا فیصلہ قوانینِ خداوندی کے مطابق ہو۔

۱۰۔ مومن کی زندگی کیا ہے؟ ایسی زندگی جو خود اپنی اندرونی کشمکش سے بھی امن میں ہو اور جس سے پوری انسانیت امن میں رہے۔

۱۱۔ وحیٔ خداوندی سے بے نیاز ہو کر انسان زندگی کا توازن کھو بیٹھتا ہے۔

۱۲۔ مومن تمام راتیں اور تمام دن زندگی گزارتا ہے جب کہ غیر مومن اپنی عمر کے کچھ لمحات کے سوا زندگی نہیں گزارتا۔

۱۳۔ صداقت کے راستے میں مرنے کی تڑپ زندگی کا سب سے بلند مقام ہے۔

۱۴۔ اصل مقصد زندگی 'مسابقت فی الخیرات' ہے۔ یعنی انسانیت کی فلاح و بہبود کے کاموں میں آگے بڑھنا۔

۱۵۔ کسی انسان کی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کے ماپنے کا پیمانہ یہ ہے کہ جب وہ دنیا میں آیا تو اس نے دنیا کو کیسا پایا اور جب وہ وہاں سے گیا تو دنیا کو کس حالت میں چھوڑا۔

۱۶۔ زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اسے یا کفر کے راستے پر چلاؤ یا ایمان کے راستے پر۔

۱۷۔ جب میں زندگی کے کسی دوراہے پر کھڑا ہوں تو خدا کا قانونِ مکافات اس کا انتظار کرتا ہے کہ میں کونسا راستہ اختیار کرتا ہوں۔ میں جس راہ پر چل پڑوں۔ اس راستہ سے متعلق قانون میرے پیچھے لگ جاتا ہے اور میرے عمل کا نتیجہ مرتب کرنا شروع کر دیتا ہے۔

۱۸۔ جنتی زندگی کا دوسرا نام اسلامی نظام ہے۔

۱۹۔ انسان مرتا ہے تو اس کی عمر ختم ہوتی ہے' زندگی ختم نہیں ہوتی۔

۲۰۔ زندگی وہی ہوتی ہے جو آبِ رواں کی طرح آگے چلتی ہے۔

۲۱۔ ان لوگوں کی زندگی جہنم کی ہے۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود عقل و فکر سے کام نہیں لیتے۔ قرآن کا یہ اٹل قانون ہے۔

۲۲۔ اندازہ لگائیے کہ جس معاشرہ میں ہر فردِ عملِ تخلیق کو اپنی زندگی کا نصب العین (ایمان) قرار دے وہ معاشرہ کس برق رفتاری سے اوپر اُٹھتا چلا جائے گا۔ قرآن اپنے نظامِ ربوبیت کی بنیاد اسی ایمان پر رکھتا ہے۔

۲۳۔ زندگی کی شاہراہ میں اس قسم کے موڑ بڑے نازک ہوتے ہیں۔ جب ذہنیت کے بدلنے سے قوموں کی تاریخیں بدل جاتی ہیں۔

۲۴۔ جو اپنی موجودہ زندگی نہیں سنوار سکتا اور اپنی رسوائی میں مطمئن ہے' اس کی عاقبت کبھی نہیں سنور سکتی۔

۲۵۔ انسانی زندگی کو نشوونما ان قوانین کے ماتحت بسر کرنے سے ہوتا ہے جو اللہ رب العالمین کی طرف سے بنی نوع انسان کو ملے ہیں۔ ان قوانین کے مجموعہ کا نام قرآن ہے۔

۲۶۔ قرآن کی رُو سے زندگی کا مقصود کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا نہیں۔ بلکہ اپنی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما سے بلند مقامات کا حصول ہے۔

۲۷۔ قرآن کے نزدیک انسانی زندگی بیش بہا متاع ہے جس کی حفاظت نہایت ضروری ہے۔

۲۸۔ قرآنِ کریم کی رُو سے زندگی ایک دائرے میں حرکت نہیں کرتی بلکہ آگے بڑھتی ہے اور اس کے ساتھ بلندیوں کی طرف

جاتی ہے۔ اسے ارتقاء کہتے ہیں۔

۲۹۔ صحیح نہجِ زندگی اور اس میں کامرانیوں اور کامیابیوں کے لئے قوت کے ساتھ حکمت بھی ناگزیر ہے۔

۳۰۔ زندگی کے ہر سانس اور ہر قدم پر مصلّی رہنا مسلمان کا فریضہ ہے۔

۳۱۔ مومن کی زندگی ہجرت اور جہاد سے ترتیب پاتی ہے۔ یعنی اس کی زندگی کا جو مقصد خدا نے مقرر کر دیا ہے۔ جو دنیا میں قرآن کے نظامِ حق و صداقت کو قائم اور غالب رکھنا ہے۔ اس کے راستے میں جو شے حائل ہوتی ہو اسے بلا تامل چھوڑ دینا یہ ہے ہجرت اور اس مقصد کے حصول کے لئے مثبت طور پر ہر قسم کی جدوجہد کرنا۔ حتیٰ کہ اگر اس کے لئے جان بھی دینا پڑے تو اسے بھی بلا تذبذب و بلا توقف حاضر کر دینا۔ اسے اللہ نے بلند ترین عمل اور منتہائے جہاد قرار دیا ہے۔

۳۲۔ مسلمان دنیا میں امتیازی زندگی بسر کرنے آیا ہے۔ عزت و وقار، جاہ و سطوت، سربلندی و سرفرازی اس کے اعمالِ صالحہ کے لازمی نتائج ہونے چاہئیں۔ جو اعمال ایسے نتائج پیدا نہیں کرتے، ان کی صورت اسلامی ہو تو ہو ان کی روح ہرگز اسلامی نہیں۔

۳۳۔ مسلمان کی زندگی کی صورتیں صرف دو ہیں، تیسری کوئی نہیں ہے۔ یا تو وہ زمانہ کو اپنے مزاج کے مطابق بنا لیتا ہے یا اس کوشش میں جان دے دیتا ہے۔ زمانہ کے ساتھ مطابقت کرنا اس کا شیوہ نہیں۔

۳۴۔ زندگی کی انتہائی کامیابی یہ ہے کہ ایسے حالات پیدا نہ ہوں جن سے انسان پر خوف و حزن طاری رہے۔ قرآنی معاشرہ ایسے حالات پیدا کرتا ہے جن میں افرادِ معاشرہ خوف و حزن سے مامون رہیں۔

۳۵۔ خوشگوار زندگی اعمالِ حسنہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اس دنیا میں عزت و وقار کی زندگی اور آخرت میں حیاتِ جاوید۔

۳۶۔ زندگی حسنِ عمل، حسنِ عمل، حسنِ عمل، زندگی جنس گراں، جنس گراں، جنس گراں۔

استحکامِ ذات کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے آپ سے آگے بڑھ کر نوعِ انسانی کے مفادِ کلّی اور عالمگیر ربوبیت کا انتظام کرے

اصل سوال خدا کی ہستی کا نہیں بلکہ اس امر کا یقین ہے کہ خدا بذریعہ وحی انسانوں کی راہنمائی کرتا ہے۔

مرزا افضل حسین

ابلیس کون ہے؟

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی خطاب فرمایا ہے وہ اکثر مقامات پر مکالمہ کی شکل میں ہے اور مکالمہ بھی حالی ہے، قالی نہیں۔ قالی کلام کانوں سے باآواز سُنا جاتا ہے جبکہ حالی بیان حال سے معلوم ہو جاتا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے بزبانِ حال فرمایا کہ یہ کائنات اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ وجود میں آچکی ہے۔ اس پر موجود ہر چیز میرے حکم کے تابع سرگرمِ عمل ہے۔ کسی شے کو مجالِ سرتابی نہیں مگر اب جس مخلوق کو میں وجود میں لانے والا ہوں وہ یہ زمین و آسمان کی ہر چیز کو مسخر کرنے پر قادر ہو گی۔ تخلیقِ آدم کے بعد اللہ نے تمام کائناتی قوتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں۔ سب نے تعمیل کی بجز ابلیس کے جو انکاری ہو کر ملعون قرار پایا۔

کہا جاتا ہے کہ ابلیس تھا تو ایک جن لیکن اس نے ملائکہ کا استاد ہونے کا درجہ حاصل کر لیا تھا (بقول روایات) وہ کون تھا۔ اس نے انسان کی تابعداری کیوں اختیار نہ کی؟ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ابلیس، شیطان اور جن تینوں الفاظ کی حقیقت کو سمجھنا ہو گا۔ پہلے الفاظ کی لغت پیش کی جائے گی۔ پھر بتایا جائے گا کہ ابلیس کیا ہے شیطان کیا ہے اور جن کیا ہے؟

ابلیس کا عربی میں سہ حرفی مادہ (ب۔ل۔س) ہے۔ یعنی بلس جس کا بنیادی مفہوم ہے مایوس ہو جانا۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے:

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ (۳۰/۱۲)

اور جس دن قیامت برپا ہو گی مجرم مایوس ہو جائیں گے۔

ابلیس کی وہ صفت جس کی وجہ سے اسے ملعون کیا گیا، قرآن نے بالفاظِ ذیل بیان ہے:

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ... الخ (۳۸/۷۳)

پس ابلیس کے سوا سب کے سب ملائکہ نے نوعِ آدم کی اطاعت کے لئے سر
جھکا دیا، اس نے اپنی بڑائی چاہی اور وہ انکار کرنے والوں میں ہو گیا۔"

یہ عجیب بات ہے کہ دعویٰ تو ابلیس کرتا ہے۔ "میں تیرے مخلص بندوں کے سوا پوری نوعِ آدم کو گمراہ کر دوں گا۔ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ۝ (۳۸/۸۲-۸۳) لیکن اس دعوے کو عملی جامہ پہنانے والے کا نام قرآن نے شیطان بتایا ہے۔ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ (۲۰/۷) "اسے شیطان نے پھسلا دیا، گمراہ کر دیا" اور شیطانوں کے بارے میں قرآن کے پارہ اوّل میں بتا دیا گیا ہے کہ یہ آدمی ہی ہوتے ہیں کوئی غیر مرئی ہستیاں نہیں ہوتیں۔

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا ۖ وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ ۙ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ ۝
(۲/۱۴)

اور جب وہ مومنوں (مردوں عورتوں) سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں، ہم ایمان لے آئے
اور جب اپنے شیطانوں اپنے سرغنوں کی خلوت گاہوں میں جاتے ہیں تو کہتے ہیں
کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ مومنوں کے ہاں تو ہم صرف تمسخر کرنے کے لئے جاتے ہیں۔

آج کے دور میں بھی حکومت اور حکمران خود تو اپنی اپنی آماجگاہوں، محلّوں، پلازوں میں بیٹھے رہتے ہیں اور جس کسی کو بلیک میل کرنا ہو یا زک پہنچانا ہو تو اپنے پالتو شیاطین (غنڈوں) سے کام لیتے ہیں۔ کسی کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ تیر کہاں سے برس رہے ہیں۔

نظر آیا کہ نوعِ انسانی کو گمراہ کرنے کا دعوے تو ابلیس کرتا ہے مگر اس دعوے کو پورا شیطان کرتا ہے۔ گویا ابلیس نام ہے جذبۂ انکار و تکبّر کا۔ أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ (۲/۳۴) اور شیطان اس فردِ مجسّم کو کہا جائے گا جس کا جذبۂ انکار و تکبّر عملی صورت میں کام کر رہا ہو۔ یعنی اُس میں احکامِ خداوندی کا انکار پایا جائے اور اسے اپنی بڑائی مطلوب ہو۔

یاد رہے کہ قرآنِ کریم کا کوئی لفظ بھی حادثاتی نہیں۔ انسان کو گمراہ کرنے کا دعویٰ ابلیس کے لفظوں میں اور اس دعوے کو بصورتِ فاعل پورا کرنے کے لئے ابلیس کی بجائے شیطان کا لفظ آنا کوئی اتفاقی امر نہیں بلکہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ ابلیس ایک قوت و جذبہ ہے اور یہ قوت و جذبہ جس شخص میں ہو وہ شخص شیطان ہے۔

شیطان لفظ کا عربی میں سہ حرفی مادہ (ش۔ ط۔ ن) ہے اور شیطان کا مفہوم لمبی بٹ دار رسی۔ بٹ اور لمبائی دونوں چیزیں ایک جگہ جمع کریں تو مادہ شطن کا تقاضہ پورا ہو جاتا ہے لیکن یاد رکھنے والی بات یہ ہے

کہ بٹ رسّی کی ذاتی چیز نہیں ہے۔ البتہ رسّی کے ریشوں میں لمبا ہوتے چلے جانے کی خاصیت موجود ہے۔ اسی طرح انسان چونکہ صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا گیا ہے اس لئے اس میں رحمانی جذبہ کے ساتھ ساتھ ابلیسی جذبے کو قبول کرنے کی خاصیت بھی موجود ہے۔ جب یہ ابلیسی جذبہ سے مغلوب ہو کر ابلیسی کام کر گزرتا ہے تو وہی انسان 'شیطان' کہلاتا ہے۔

ابلیسی جذبے سے مغلوب انسان میں مادہ شطن کا بٹ اور لمبائی اس قدر ہوتی ہے کہ اس کا ہر کام احکامِ خداوندی کے الٹ اور بٹا ہوا ہوتا ہے جس کی لمبائی شیطان کی آنت کی طرح اتنی دراز ہوتی ہے کہ کہیں رکنے کا نام نہیں لیتی۔ اصلاحی طاقت اگر مقابلہ پر موجود نہ ہو یا کمزور ہو تو ابلیسی جذبہ سے مغلوب انسان جب لوٹ مار پر آجائے، تو سینکڑوں نہیں کروڑوں خاندانوں کی تباہی سے بھی گریز پا نہ ہوگا۔ یا اگر ایسا شخص قتل پر آئے، تو انسانی کھوپڑیوں کا انبار لگا دے۔ عصمت دری کی ابلیسی وادیوں میں قدم رکھے تو ہر نئی دلہن کی شبِ عروسی کو اپنے لئے مخصوص کر لے۔ اور اگر الوہیتِ خداوندی پر ڈاکہ ڈالنے کی ٹھان لے تو خود خدا بن بیٹھے اور کمزوروں سے کہے کہ مجھے ہی مشکل کشا کہو۔ اہل روایات نے تو آج تک قرآن کو غلافوں میں لپیٹ رکھا تھا کیونکہ یہ کسی کا لحاظ نہیں رکھتا، ہر بات کھری کھری سُنا جاتا ہے۔ لوٹ مار پر نظر دوڑا لیں، قتل و غارت پر غور کر لیں، عورت کی عصمت دری کو لے لیں، قرآن نے ایسے تمام لوگوں کو شیطان کہا ہے۔

عربی زبان میں لفظ 'شیطان' سانپ اور غصّہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ وہ اس طرح کہ ش ط ن کا مادہ چونکہ بٹ دار رسی ہے اس لئے اس میں جتنے بٹ زیادہ آئیں گے اتنا ہی اس میں اضطراب بڑھے گا۔ رسّی پہلو بدلے گی اور بے قرار دکھائی دے گی۔ یہی حالت انسان کی ہوتی ہے۔ جب اسے غصّہ آتا ہے تو وہ مضطرب و بے قرار دکھائی دینے لگتا ہے۔ عربی میں اسی لئے اس کے معانی غصّہ کے لئے جاتے ہیں۔ عربی میں رَاکِبَہٗ شَیْطَانُہٗ کے معنی ہیں 'اس پر غصّہ سوار ہو گیا'۔ اسی کی مثال آپ کو قرآن میں بھی ملے گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک قبطی کو مُکّہ جڑ دیا، وہ مر گیا، اس دنیا سے اٹھ گیا، تو آپ نے فرمایا،

هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ۝ (۲۸/۱۵)

یہ شیطانی عمل ہے! بیشک شیطان ظاہر اد شمن اور گمراہ کرنے والا ہے۔

یعنی یہ جو فعل مجھ سے سرزد ہو گیا ہے یہ میرے غصّے کی وجہ سے ہوا اور غصّہ، ہر فرد جانتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ گویا غصّہ ظاہر اد شمن ہے۔ جب یہ عقل پر سوار ہو جاتا ہے تو سوچ والی مخفی قوت (ملک) کام کرنا وقتی طور پر بند کر دیتی ہے۔

اب شیطان کو سانپ کے معنوں میں لیجئے۔ رسّی کو بٹ دیجئے اور پھر اسے زمین پر پھینک کر دیکھئے یہ کس طرح

بل کھاتی ہے۔ اسی مناسبت سے عربی میں شیطان کو سانپ بھی کہتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایک پودا ہوتا ہے جسے ہم تھوہر کے نام سے جانتے ہیں۔ اس پر ایک پھل آتا ہے اس کی شکل بھی سانپ کے پھن جیسی ہوتی ہے جیسے پھن پھیلائے کھڑا ہو۔ اسی لئے قرآن میں ارشاد ہوا کہ :-

طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ○ (۳۷/۶۵)

گویا اس کا پھل (تھوہر کا) پھن دار سانپ کے جیسا ہے۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ لفظ شیطان سانپ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، تو گویا قرآن کی رو سے شیطان کے تین معنے سامنے آئے ہیں۔

۱۔ غصہ۔ ۲۔ سانپ۔ ۳۔ وہ فردِ مجسّم جس میں ابلیسیت کارفرما ہو۔ چنانچہ ہر وہ فرد (مہذب ہو یا غیر مہذب (۲/۱۴) جو ابلیسیت کا آلۂ کار ہو شیطان ہے۔

جن

اس کا سہ حرفی مادہ ج۔ن۔ن ہے اور اس کے معنی ہیں چھپا لینا۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے کہ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ... (۶/۷۷) "جب رات نے اس پر اندھیرا کر دیا، چھپا لیا۔ یہ جنّ لفظ بھی ابلیس کے لئے بولا گیا۔ مِنَ الْجِنِّ " وہ جنوں میں سے تھا۔" ایک اور لفظ قرآن میں عام استعمال ہوا ہے جُنَّةٌ اس کا مادہ بھی جنن ہے۔ جس کے معنی ڈھال ہیں۔ ڈھال ایک ایسا آلہ ہے جو دشمن کے وار سے انسانی جسم کو چھپا لیتا ہے۔

ایک اور لفظ مَجْنُوْنٌ ہے۔ اس کا مادہ بھی جنن ہے۔ یہ اس انسان کے لئے بولا جاتا ہے جس کے دماغ کو کسی بیماری نے بے شعور کر دیا ہو یا چھپا لیا ہو۔

ایک لفظ جَنِيْنٌ ہے۔ وہ بچہ جو ماں کے پیٹ میں چھپا ہوا ہو۔

قرآنِ کریم میں یہ لفظ جمع کے صیغہ میں آیا ہے۔ اللہ خود نوعِ انسان کو مخاطب کرکے کہتے ہیں کہ :-

هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ (۵۳/۳۲)۔ (یہ آیت بڑے گہرے معانی والی ہے)۔

وہ اللہ تمہاری اس حالت کو بھی جانتا ہے جب تمہیں زمین سے پیدا کیا گیا اور اُسے بھی تم جب ماؤں کے پیٹوں میں بصورتِ جنین پوشیدہ ہوتے ہو۔

ایک اور لفظ جَنَّةٌ ہے۔ اس کا مادہ بھی جنن ہے جس کا مطلب ہے وہ باغ، جس کی زمین یا تو سبزے سے ڈھکی

ہوئی ہو یا باغ میں درخت اس قدر زیادہ ہوں کہ درختوں کے سائے سے وہ زمین چھپ جائے، ڈھک جائے۔

قرآن نے غیر ملکی ماہرین کو بھی جنّ کہا ہے۔ جیساکہ (۱۳- ۱۲/۳۴) میں کہا گیا ہے اور جنّوں میں سے ایک جماعت تھی جو اپنے بادشاہ کی اجازت سے حضرت سلیمان علیہ السّلام کے آگے کام کرتی تھی۔ ان میں سے جو نافرمانی کرتا تھا۔ ہم اسے دردناک عذاب کا مزہ چکھاتے تھے۔ مندرجہ بالا آیت میں دو الفاظ ہیں مُحَارِیْبَ تَمَاثِیْلَ۔ جن کا مطلب ہے فوجی اوزار اور نقشے۔ (وہ جنّ) سلیمان کے لئے فوجی اوزار اور قلعوں کے نقشوں اور تالابوں جیسے بڑے بڑے ٹینکوں اور ایک جگہ پڑی رہنے والی دیگوں کو جو وہ بنوانا چاہتا تھا، بناتے تھے۔

مندرجہ آیت میں جنّوں سے مراد وہ عوام کے مزعومہ جنّ نہیں، جو ہیں تو آگ کے بنے ہوئے لیکن دکھائی نہیں دیتے اور وہ اپنی شکلیں بھی تبدیل کر سکتے ہیں۔ انسان، حیوان، مچھر، مکھی وغیرہ بن جاتے ہیں، اپنے اعضا کم یا زیادہ کر کے لاہور ماڈل ٹاؤن یا منصورہ میں بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کے کشمیر کے باغوں سے سیب توڑ لیتے ہیں، غیب دان بھی ہیں اور اگر صرف نوجوان لڑکی ان کی قیام گاہ کی بے ادبی کرے تو اس کے اندر گھس جاتے ہیں۔

یاد رہے آیت بالا میں ایسی کوئی بات موجود نہیں بلکہ یہ جنّ خدمت گار تھے اور جو کام کرنے سے انکار کرتا تھا حضرت سلیمان علیہ السّلام اسے سخت سزا دیتے تھے جو لوہے کی بیڑیوں جیسی زنجیریں تھیں (۳۸/۳۸)۔

سوال یہ ہے کہ یہ جن اگر ہمارے روایتی جن تھے، تو وہ حضرت سلیمانؑ کی زنجیروں میں کیسے جکڑے رہتے تھے وہ مچھر مکھی بن کر اڑ کیوں نہ جاتے تھے؟ اور اگر وہ غیب دان بھی تھے تو کیا انہیں معلوم نہ تھا کہ ہم نے کام نہ کیا تو حضرت سلیمان علیہ السّلام ہمیں زنجیروں میں جکڑ دیں گے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنے ملک سے ہی نہ آتے یا حضرت سلیمان علیہ السّلام کی وفات پر (جسے سیاسی مصلحتوں کے تحت چھپایا گیا تھا) اس عذاب سے از خود آزاد ہو جاتے۔ (۳۴/۱۴)۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ قرآن نے ماہرین کو جن کیوں کہا جب کہ اس لفظ کا مادہ جنن کا تقاضا پورا نہیں کرتا۔ یاد رہے کہ عربی ادب بھی کمال کا ہے۔ اس میں جنن اس چیز یا جاندار کو بھی کہتے ہیں جو دکھائی دیتے ہوئے غائب ہو جائے۔ وہ ماہر غیر ملکی تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السّلام کے ملک کے باشندے نہ تھے سلطنت میں آنے سے پہلے بھی وہ غائب تھے اور کام ختم کرنے کے بعد جب وہ اپنے ملک واپس چلے گئے تو نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اس نسبت سے ایسے لوگوں کو جنّ کہا گیا ہے۔

عربوں کے ہاں دیہاتی لوگوں کو بھی جنّ کہتے ہیں کیونکہ وہ شہر میں آتے ہیں واپس جاتے ہیں تو وہ شہریوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

قرآن نے یہودیوں کو بھی جن کہا ہے (۲۹ ــ ۳۰/ ۴۶) جنہوں نے قرآن سُنکر اپنی قوم کو جاکر بتایا۔ نازل ہونے والی کتاب جو موسیٰؑ کے بعد ہے، نازل ہو چکی ہے۔ یاد رہے کہ یہودی انسان ہی تھے اور حضرت موسیٰؑ ان کے پیغمبر تھے۔ وہ کسی غیر مرئی مخلوق کے پیغمبر نہ تھے۔ جن کی خوراک (بقول روایات) ہڈیاں، لید اور گوبر بتائی جاتی ہے جب کہ قرآن نے ان کی خوراک اجناس، کھجور اور انگور جیسے میوہ جات بتائی ہے اور یہ خوراک انسانی خوراک ہے (۱۱ ــ ۱۳/ ۵۵) اور سورۂ رحمٰن تو ایسی آیات سے بھری پڑی ہے۔ یہاں اللہ صحرائی، شہری، مدنی، بدوی لوگوں سے مخاطب ہے اور یہ سب انسان ہیں۔ جنوں کی خوراک اگر ہڈیاں، لید، گوبر اور کوئلہ ہے تو اللہ کی طرف سے کھجور، انگور اور اجناس کی عطا کا احسان کیسا؟

ہم اس مقام پر پہنچے کہ جن و انس ایک ہی جنس کے دو نام ہیں (۴۳ ـــ ۴۲ [۴۵ ـ ۴۴]/ ۵۵؛ ۱۸۵/ ۷)۔ جن انسان سے کوئی علیحدہ چیز نہیں ہے۔ یہ انسانوں ہی کا وہ طبقہ ہے جو غیر متمدن خانہ بدوشوں کی زندگی گزارتا ہوا شہری لوگوں سے پوشیدہ رہتا ہے اور زمانہ رسالتؐ میں یہ طریق عام تھا۔ آیت (۱۷/۸۸) کا مفہوم بڑا واضح ہے لیکن اکثر لوگ پھر بھی اس قرآن پر روایات کو ترجیح دیتے ہیں۔ آیت ۱۷/۸۹ ایک تھپڑ ہے ان لوگوں کے منہ پر جنہوں نے حق سے ہمہ جہت اجتناب کی ٹھان رکھی ہے۔

آگے بڑھیں تو نظر آئے گا کہ جن و انس ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ آیت مذکورہ (۱۷/۸۸) کے بعد (۱۷/۸۹) میں الناس کا لفظ آیا ہے۔ اس سے مراد الناس ہی کے دونوں گروہ ہیں، مدنی اور بدوی اور یہ دونوں انسان ہی ہیں۔

پورے قرآن میں کسی ایسی کتاب کا ذکر نہیں جو کسی غیر مرئی مخلوق کے لئے اتاری گئی ہو اور نہ ہی یہ بات ملیگی کہ فلاں پیغمبر غیر مرئی مخلوق کا پیغمبر تھا یا ہے۔ لہٰذا قرآن نے (۸۹ ـ ۸۸/ ۱۷) سے واضح کر دیا کہ جن و انس ایک ہی جنس کے دو نام ہیں اور بدوی گروہ کو قرآن نے جن کہہ کر پکارا ہے۔

آج کے دور میں بھی ہم کسی کو وکیل، کسی کو جج، کسی کو وزیر، کسی کو مشیر، کسی کو مستری اور کسی کو درزی کہتے ہیں لیکن سب ہوتے انسان ہی ہیں۔ یہ بہت قدیمی اصطلاح ہے۔ حضرت انسان نے کرۂ ارض پر جب رہائش اختیار کی تو نہ جھونپڑے تھے نہ گاؤں نہ قصبے نہ شہر، صرف پہاڑوں میں غاریں اور زمین میں کھڈ تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ضرورت نے یہ سب کچھ انسان سے پیدا کروا لیا کیونکہ اللہ نے انسان کی جبلت میں علم ودیعت کر رکھا تھا جنہوں نے فکر کیا وہ غاروں سے باہر آ گئے۔ جھونپڑے، پھر مکان بنا لئے۔ جیسا کہ آج کے دور میں بھی ہے۔ جنہوں نے زیادہ غور و فکر کیا وہ محلات میں پہنچ گئے جبکہ فکر نہ کرنے والے آج بھی جھونپڑی میں ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ اسی طرح جو اس وقت غاروں میں پوشیدہ رہے وہ جن کہلائے اور جو تمدنی زندگی اختیار کر کے مکانوں میں آباد ہو گئے وہ انسان

کہلائے۔ قرآن خبر دیتا ہے کہ انسانوں سے پہلے ایک مخلوق نارِ سموم سے پیدا کی تھی مگر آج کی دنیا میں اس کا کہیں وجود نہیں ہے (۱۵/۲۷)۔ ہوسکتا ہے اس کی قیامت ہو چکی ہو۔ یہ عقل تو بہرحال عاجز ہے کہ (۱۵/۲۷) کے بارے میں حتمی طور پر کوئی رائے قائم کرسکے۔

سوال یہ بھی ہے کہ کیا ابلیس سے مراد وہی ابلیس ہے جو اللہ کی طرح ہر جگہ حاضر و موجود ہے۔ راقم کا جواب نفی میں ہے کیونکہ یہ بات طے ہے کہ ابلیس ملائکہ میں سے ہے اور اس کا مخصوص ملکہ انکار و تکبّر ہے (۲/۳۴) اس کے آگے ہے وہ جنّ بھی ہے (۱۸/۵۰)۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ وہ ملک ہوتے ہوئے جنّ کس طرح ہے؟ تھوڑا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ۲/۳۴ کے مطابق وہ ملک ہے اور ۱۳/۴۵ کے مطابق ہر کائناتی قوت ملک ہے اور اس طرح قوتِ انکار و تکبّر بھی ملک ہوئی۔ اس کا دعویٰ ہے کہ میں سب لوگوں کو گمراہ کرتا رہوں گا۔ یہ ہے کہاں؟ قرآن بتاتا ہے کہ یہ نفسِ امّارہ کی صورت میں خود انسان کے اندر موجود ہے (۱۲/۵۳) اور یہ قوت ہر آن اپنا یہ دعویٰ پورا کر رہی ہے کہ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۱۵/۳۹)۔ مادہ ج ن ن کے مطابق یہ جن ہے اور مخصوص ملکہ کے مادہ م۔ل۔ک کے مطابق یہ ملک ہے۔ اب جو شخص ابلیسیت اپنا کر انکار و تکبّر کا پیکر بن جاتا ہے وہی شیطان ہے۔ شیطان کا الگ سے کوئی وجود نہیں۔ اس کی مثال ہماری حکومت اور ہمارے حکمران ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک ہر حکمران یہی رٹ لگا رہا ہے اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ۔ جھوٹ پہ جھوٹ بولے جا رہے ہیں۔ اخبارات میں جھوٹ، رسائل میں جھوٹ، ٹی وی پہ جھوٹ، ریڈیو پہ جھوٹ، عدالتوں میں جھوٹ، لین دین میں جھوٹ، اسلام کے نفاذ کا جھوٹ۔ مگر حیرت ہے کہ ابلیس پر کچھ اثر نہیں ہو رہا۔ کوئی قرآنی آیت بھی اثر نہیں کر رہی۔ بلکہ شیطان مزید بھڑک اٹھتے ہیں

پاکستان دو قومی نظریے کی بنا پر وجود میں آیا تھا لیکن اب تک محکمہ مال اور انتظامیہ کے ریکارڈ میں خاندانی تعارف کو قوم کا درجہ دے کر گوجر، اعوان، ڈھونک، ستی، کھوکھر، گکھڑ وغیرہ کو قوم کا درجہ دیا جا رہا ہے۔ اس کو ختم کر کے دو قومی نظریے کے مطابق قومیت کو دو خانوں مسلم/غیر مسلم تک محدود کر دیا جائے اور پاکستانیوں کی شناخت کو مسلم/غیر مسلم اور پھر شناختی کارڈ کے استعمال سے آئینی صورت دی جائے۔

راقم الحروف: محمد ارشاد ٹیچر۔ مری۔

ڈاکٹر سید عبدالودود

ملاوٹ

(دین میں ملاوٹ کا نیا انداز)

مملکتِ پاکستان کے لئے کون سا طرزِ حکومت مناسب ہے؟

اس مسئلہ کے حل کے لئے جو سب سے اہم نکتہ درپیش ہے وہ یہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست میں حکومت کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہوتا ہے اور اس حکومت کا نفاذ اس کتاب کے ذریعے ہوتا ہے جو بذریعہ وحی حضور نبی اکرمؐ پر نازل ہوئی۔ ایک اسلامی مملکت میں ہر وہ مسئلہ جس کا ذکر قرآنِ کریم میں موجود نہیں، باہمی مشاورت سے طے پاتا ہے یہ وہ مسائل ہیں جن کو زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق طے کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ گویا قرآن نے خود اجازت دی ہے کہ ان معاملات کو قرآن کے احکامات، قوانین اور مستقل اقدار کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے خود طے کریں اور طرزِ حکومت (FORM OF GOVERNMENT) کا مسئلہ بھی انہیں میں سے ایک ہے۔ سب سے پہلے اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ آیا پاکستان کا موجودہ وفاقی طرزِ حکومت (FEDRAL FORM OF GOVERNMENT) قرآنی نظام سے موافقت رکھتا ہے یا نہیں؟

(۱) جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ ایک وفاقی حکومت اس وقت معرضِ وجود میں آتی ہے جب وفاق میں شامل ہونے والی حکومتیں صاحبِ اقتدار اور آزاد ہوں اور ان کے باہمی گٹھ جوڑ کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ انفرادی طور پر کسی بیرونی AGRESSION یا حملے کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہوتیں یا وہ اکیلے رہنے کی صورت میں اقتصادی طور پر کمزور ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ صرف باہمی رضامندی سے ایک دوسرے کے ساتھ ملاپ پیدا کرتی ہیں۔ لیکن مملکتِ پاکستان کی صورت حال اس سے مختلف ہے۔ یہ مملکت ہندوستانی مسلمانوں کے ایک واحد قوم ہونے کی حیثیت سے معرضِ وجود میں آئی تھی جو ہندوستانی ہندوؤں سے الگ ایک قوم تھی۔ پاکستان کے موجودہ صوبوں میں تقسیمِ ملک سے پیشتر کوئی آزاد اور خود مختار حکومتیں قائم نہ تھیں۔ یہ صوبے صرف حکومتِ

برطانیہ کے انتظامی یونٹ تھے۔

(۲) دوسری بات جو فیڈرل حکومت کے بارے میں بیان کی گئی تھی وہ یہ تھی کہ فیڈرل یونٹوں کے اندر باہمی ملاپ سے متحدہ حکومت قائم کرنے کی شدید خواہش کا ہونا لازمی ہے۔

لیکن یہ بات عیاں ہے کہ پاکستانی جو تقسیم ملک کے وقت ایک قوم تھے اور جن کے اندر تحریکِ پاکستان کے وقت نہ صرف یکجائی کی خواہش موجود تھی بلکہ وہ عملی طور پر یکجا تھے۔ پاکستان میں انتظامی یونٹوں کو نیم خودمختار صوبوں میں تبدیل کرکے ان کی یکجائی کو بے رحمی سے کچل دیا گیا ہے۔

(۳) فیڈرل اور صوبائی حکومتیں ایک دوسرے کے دائرۂ اقتدار میں دخل اندازی نہیں کرسکتیں اور نہ ہی ایک دوسری کو یکسر ختم کرسکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں قرآن کے بنیادی تصورات کا پورے ملک میں یکساں طور پر نفاذ بے حد مشکل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فیڈریشن کے اندر ملاپ کرنے والے یونٹوں میں صرف تعاون ہوتا ہے یکجائی نہیں ہوتی۔ بالفاظِ دیگر یونٹوں میں (UNION) ہوتی ہے UNITY نہیں ہوتی جو کہ قرآنی نظام کے لئے لازمی ہے۔ چنانچہ فیڈریشن میں ایک طرف یکجائی کی خواہش اور دوسری طرف علیحدگی کا تصور دونوں یکساں طور پر موجود ہوتے ہیں۔

(۴) علاوہ ازیں فیڈریشن کی صرف خواہش ہی نہیں بلکہ اسے عملی شکل دینے کی استطاعت بھی لازمی ہے۔ نسل، زبان، مذہب اور سیاسی ادارے ایک قوم بننے کے راستے میں حائل ہوتے ہیں۔ پاکستان میں یہ عنصر شروع سے موجود ہے اور اس کے نتیجے میں ملک بھی دولخت ہوچکا ہے اور دن بدن حالت خراب ہوتی جارہی ہے۔

(۵) فیڈرل یونٹس کا معاشی طور پر مضبوط ہونا لازمی ہے تاکہ وہ مرکز اور یونٹس دونوں کو سہارا دے سکیں۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کے موجودہ صوبے معاشی طور پر یکساں نہیں۔ اور اس کا دوسرا پہلو جو کہ واضح ہے وہ یہ ہے کہ معاشی عدم یکسانیت تھوڑی ہو یا زیادہ لیکن یونٹوں کے درمیان ایک دوسرے پر بے یقینی کی صورت ضرور قائم رکھتی ہے۔ کیا بنگلہ دیش کی پاکستان سے علیحدگی اسی بداعتمادی کا نتیجہ نہیں؟

(۶) فیڈریشن کا لازمی جزو (CONSTITUTION) آئین ہے جو کہ فیڈریشن کی بنیاد ہے لیکن پاکستان کے موجودہ آئین کی شقیں جگہ جگہ پر قرآنِ کریم کے واضح اور غیر متبدل احکام کے خلاف موجود ہیں۔ موجودہ آئین یا اس سے پیشتر کے آئین جو مملکتِ پاکستان میں بنتے اور ٹوٹتے رہے ہیں ان کا قرآنی نظام کے ساتھ ٹکراؤ واضح ہے۔ موجودہ آئین کی بعض شقیں اور قرآن کے احکام، قوانین اور مستقل اقدار ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس آئین کی موجودگی میں قرآنی نظام کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

(۷) پاکستان کے فیڈرل یونٹس، رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے بھی ناہموار ہیں اور یہ معاملہ بھی حکومت کی کارکردگی میں دخل انداز

ہوتا ہے۔

(۸) علاوہ ازیں FOREIGN AFFAIRS کے معاملات میں متفقہ طور پر عہدہ برآ نہ ہونا بھی فیڈرل حکومت کی کمزوری ہے۔ فیڈرل یونٹس اپنی حدود کے اندر افراد کی جائیداد اور ان کے دیگر حقوق پر خصوصی کنٹرول کی وجہ سے مرکزی حکومت کے لئے دردِ سر بن سکتے ہیں۔ بھاریوں کی پاکستان میں منتقلی کا مسئلہ سب پر عیاں ہے۔ برسوں سے کیا ہو رہا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں دنیا میں فیڈرل حکومت موجود ہے وہاں مرکزی حکومت کے اختیارات میں اضافہ کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے۔

(۹) فیڈرل حکومت دوہری حکومت ہونے کے باعث مہنگی طرزِ حکومت ہے۔

دوسرا قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ کیبنٹ (یا پارلیمنٹری) فارم آف گورنمنٹ اور صدارتی فارم آف گورنمنٹ ان دونوں میں سے کونسی حکومت موزوں ہے اور کس قدر؟ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، ان دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اگر قانون سازی اور ایگزیکٹو کے دونوں ادارے یکجا ہوں۔ یعنی ایک ہی گروپ کے پاس ہوں تو یہ طرزِ حکومت کیبنٹ یا پارلیمنٹری کہلاتی ہے اور اگر یہ دونوں ادارے الگ الگ اور خود مختار ہوں تو یہ صدارتی طرزِ حکومت کہلاتی ہے۔

کیبنٹ یا پارلیمانی طرزِ حکومت میں مملکت کا سربراہ ایک معینہ مدت تک کے لئے منتخب کیا جاتا ہے لیکن اس کے اختیارات برائے نام ہوتے ہیں، گو قانونی طور پر اس کے پاس تمام اختیارات ہوتے ہیں جو آئین نے اسے دیے ہوں لیکن عملی طور پر وہ ان میں سے کسی پر عمل درآمد نہیں کرتا۔ درحقیقت ایگزیکٹو پاور کیبنٹ کے پاس ہوتی ہے۔

اب دیکھئے کہ کیبنٹ فارم آف گورنمنٹ جو اس وقت پاکستان میں رائج ہے، اس کے نقائص کیا ہیں؟ گو اس طرزِ حکومت کے کچھ فوائد بھی ہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ جب قانون سازی اور ایگزیکٹو یکجا ہو جائیں تو حکومت کا ظالم اور جابر بننے کی طرف رجحان ہوتا ہے اور اس طرزِ حکومت میں وزراء، جن کے ذمے قانون سازی بھی ہوتی ہے اور ان کو اپنے مجوزہ قوانین کو پارلیمنٹ سے منظور بھی کروانا ہوتا ہے۔ وہ ایگزیکٹو ڈیوٹی پر پوری توجہ نہیں دیتے اور دوسری طرف پارلیمنٹ FOREIGN AFFAIRS جیسے اہم معاملات میں مصروف ہو کر قانون سازی کی طرف اکثر متوجہ نہیں ہوتی۔

علاوہ ازیں کیبنٹ حکومت غیر مستحکم ہوتی ہے۔ اس کے استحکام کا دارومدار پارلیمنٹ میں ان کی پارٹی کی اکثریت پر ہوتا ہے اور ممبروں کی متلون مزاجی اور خود غرضیاں اکثریت کو بنانے اور بگاڑنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ چنانچہ پاکستان کی پارلیمنٹوں میں اکثریت، اقلیت میں اور اقلیت، اکثریت میں بدلنے کا رجحان شدت سے قائم رہا ہے جو کہ سب پر عیاں

ہے۔ چنانچہ اس طرزِ حکومت میں برسرِ اقتدار پارٹی میں نہ استقلال باقی رہتا ہے اور نہ دور اندیشی۔

علاوہ ازیں قوم کو اگر کوئی نازک مرحلہ پیش آجائے جہاں فوری توجہ اور فوری فیصلوں کی نہ صرف ضرورت ہوتی بلکہ ان پر فوری عمل درآمد بھی درکار ہوتا ہے، تو ایسی صورت میں کیبنٹ حکومت کمزور ثابت ہوتی ہے۔ پاکستان میں اس کا ملاحظہ ہم خلیج کی جنگ میں کر چکے ہیں جب بھانت بھانت کی آراء سامنے آکر ایک دوسرے سے ٹکراتی رہیں۔

صدارتی طرزِ حکومت کے فوائد

صدارتی طرزِ حکومت میں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ صدر گو بذریعہ انتخاب سامنے آتا ہے لیکن اس کا دورانِ حکومت قانون ساز ادارے کے ممبران کی اکثریت پر منحصر نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک معینہ مدت تک برقرار رہتا ہے۔ اسی وجہ سے اس طرزِ حکومت کی پالیسیاں دیرپا ہوتی ہیں اور بلا ردّوبدل تادیر برقرار رہتی ہیں۔ گویا اس طرزِ حکومت کی بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ حکومت جمہوری عمل سے معرضِ وجود میں آتی ہے اور اس کے بعد مستحکم بھی رہتی ہے۔ چنانچہ فوری عمل، مضبوطی اور (INITIATIVE) اختراع اس حکومت کے عناصر ہیں۔ اس لئے کسی ایمرجنسی کے وقت معاملات پر کنٹرول کی یک جہتی، فوری فیصلے اور فیصلے پر مضبوط گرفت بروئے کار آتے ہیں۔

صدارتی طرزِ حکومت میں، پارٹی معاملات کے بکھیڑے میں پڑے بغیر ماہرین کو مختلف شعبوں کے سربراہ مقرر کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایسے ممالک جن میں آبادیاں مختلف ہوں اور ان کی دلچسپیاں بھی مختلف ہوں، صدارتی حکومت بہترین ثابت ہوتی ہے۔ دوسری طرف صدارتی طرزِ حکومت کی جو خرابیاں بیان کی جاتی ہیں وہ یہ ہیں:

انتظامیہ اور مقننہ میں قوت کی تقسیم کے باعث کسی معاملے میں اتفاقِ رائے پر پہنچنے کے لئے غیر ضروری تاخیر ہو جاتی ہے۔ یہی صورت فوری حل طلب معاملات میں بھی ہوتی ہے۔ خصوصاً جب حکومت کے ایک ادارے میں ایک پارٹی کی حکومت ہو اور دوسرے ادارے میں دوسری پارٹی کی، اور پھر ہر دو پارٹیوں میں اختلافِ رائے بھی ہو۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انتظامیہ کی قانون سازی میں براہ راست عدم شمولیت صدارتی طرزِ حکومت کا کمزور پہلو ہے قانون سازی انتظامیہ ہی کے ذمہ ہونی چاہیئے۔ اس کے بغیر انتظامیہ اور مقننہ میں ربط قائم نہیں رہتا اور یہ مضبوط پالیسی کے راستے میں سدِ راہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں صدارتی طرزِ حکومت خودسر، غیر ذمہ دار اور خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔

لیکن مبینہ کمزوریوں کے باوجود یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکہ میں صدارتی حکومت کامیاب طریق سے چل رہی ہے۔ گو چند دیگر ممالک مثلاً لاطینی امریکہ، فلپائن اور جنوبی کوریا میں یہ کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس کا مطلب یہ

ہے کہ اس میں کامیابی یا ناکامی کی صورت ملکوں کے مختلف حالات پر بھی منحصر ہے۔

وحدانی طرزِ حکومت

یہ سب سے زیادہ مضبوط طرزِ حکومت ہے۔ سادہ بھی ہے اور لچک دار بھی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے اندر آسانی سے تبدیلیاں لا سکتی ہے۔ اور علاوہ ازیں اس کا بہترین نکتہ اس کی UNITY وحدانیت ہے۔ یہ مختلف اجزاء کو مصنوعی طور پر یکجا کر کے معرضِ وجود میں نہیں آتی۔ اسی بنا پر مملکتِ پاکستان میں اللہ تعالیٰ کی SOVEREIGNTY اقتدارِ اعلیٰ کے قیام میں بہترین ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے کیونکہ کنٹرول صرف ایک ادارے کے پاس ہوتا ہے۔ اس کی مرکزی اتھارٹی کو صدر کہہ لیجئے یا خلیفہ کہہ لیجئے۔ لازماً اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوگا کہ ہم مملکتِ پاکستان میں واحد مرکزی اتھارٹی کے پاس قوت کے مرکوز ہونے کے کئی پہلو دیکھ چکے ہیں جن سے مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملا۔

لیکن ایک ڈکٹیٹر اور خلیفہ میں فرق کرنا لازمی ہے۔ گویا یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستان کے موجودہ معاشرے میں کسی ایسے شخص کو بطور خلیفہ سامنے لانا قریباً قریباً ناممکن ہے جو اس طریق سے نظامِ مملکت کو چلا سکے جس طرح ان خلفاء نے چلایا تھا جن کی تربیت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کی تھی۔ تو پھر اس سارے مسئلے کا لُبِّ لباب اس نکتہ پر مرکوز ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے خلفاء کیسے معرضِ وجود میں آئیں جن کو خلفائے راشدین کہا جاتا ہے۔ اس سوال کا جواب بالکل سیدھا ہے۔ وہ یہ کہ امت کے اندر وہ یک رنگی پیدا کی جائے جو حضور نبی اکرمؐ نے اپنے زمانۂ نبوت کا ۶۰ فیصد حصہ صرف کر کے پیدا کی تھی۔ یہ یک رنگی کیسے پیدا ہوتی ہے؟ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ... (۱۳/۱۱)

"کسی قوم کی خارجی دنیا میں تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اس کی داخلی دنیا، اس کے افراد کی نفسیات، ان کی ذہنیت میں تبدیلی نہ ہو۔"

افراد کے قلب و نگاہ میں یہ تبدیلی قرآن کریم پر غور و فکر سے پیدا ہوتی ہے۔ گویا قوم کی ذہنیت کو بدلنے کا ذریعہ قرآنِ کریم کی تعلیم ہے۔ ایسی تعلیم جس میں طالب علم اس قابل ہو جائے کہ دنیا کا ہر دروازہ دین کی چابی سے کھول سکے۔ یعنی نوجوانوں کے قلب و دماغ کو ایسے سانچے میں ڈھالا جائے اور ان میں ایسی صلاحیت پیدا کر دی جائے کہ دنیا کا کوئی معاملہ سامنے آئے تو وہ فیصلہ کر سکیں کہ اس باب میں قرآن کیا رہنمائی دیتا ہے۔ اس طرح قوم کی ذہنیت کو بدلے بغیر قرآنی نظام کا قیام بے حد مشکل ہے۔

قلب و نگاہ کی اس تبدیلی سے کیا ہوتا ہے؟ اس سے اشیائے کائنات کی قدر و قیمت بدل جاتی ہے۔ اس سے اقدار (VALUES) کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔ مثلاً نگاہ کا زاویہ غلط ہو تو عزت و تکریم کا معیار حسب، نسب، دولت و منصب، وجاہت و اقتدار ہوتا ہے۔ جب اقدار کا پیمانہ بدل جائے تو ان سب کے خلاف عزت و تکریم کا معیار جوہرِ ذاتی، پاکیزگی، سیرت اور بلندیٔ اقدار قرار پاتا ہے۔ حضرات انبیائے کرامؑ کی بعثت کا مقصد ہی عالمِ انسانیت میں اقدار کے پیمانوں کو بدل دینا تھا۔

پاکستان کے فرمانرواؤں نے قرآن کریم کی طرف سے آنکھیں بند کر کے قریباً نصف صدی تجربات میں گزار دی۔ پہلے مغربی جمہوریت کے تجربہ نے قوم کا پورا ڈھانچہ ہلا کر رکھ دیا۔ اس ناکام تجربے نے ڈکٹیٹرشپ کو جنم دیا جو کہ مختلف شکلوں میں معرضِ وجود میں آتی رہی۔ اب پھر مغربی جمہوریت کا نئے سرے سے تجربہ جاری ہے۔ چاروں طرف شور و غوغا ہے، استحصالی قوتیں پورے جوبن میں ہیں۔ عوام الناس کے لئے ہر نیا دن روزِ قیامت ہے۔ اس تلاطم خیزی میں قومی اخبارات کا بڑا حصہ ہے۔ وہ اس تباہ کن سسٹم کو ہر قیمت پر جاری رکھنا چاہتی ہیں تاکہ قوم اس قعرِ مذلت کی آخری گہرائی تک پہنچ جائے۔ دوسری طرف ہمارے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب جیسے ہر ان اس مغربی جمہوریت کی بھونڈی شکل پر ملمع سازی کو باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ اگر قوم اب بھی اپنا رُخ بدل کر اور قرآن کریم کے آگے سربسجود ہو کر، قرآن کریم کی تعلیم کو عام کر دے تو دو تین عشروں میں ہی ایک خوشنما تبدیلی معرضِ وجود میں آسکتی ہے اور پھر ایسے خلفاء یا صدور کا انتخاب جو قرآن کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں، ایک اچنبھا نہیں بلکہ معمول بن سکتا ہے۔

فنڈامنٹلزم

طلوعِ اسلام شمارہ ستمبر ۹۲ء کی اشاعت میں، میں نے اپنے مضمون "دین میں ملاوٹ" کے آخر میں ذکر کیا تھا کہ فنڈامنٹلزم بنیاد پرستی کی اصطلاح جو اس زمانے میں عام ہوئی ہے اس کے معنی اور مقاصد کیا ہیں؟ ماہنامہ نوائے وقت، مورخہ ۱۳ اکتوبر ۹۲ء کے شمارہ میں محترم محمود احمد مرزا کنوینر فرینڈم فورم اپنے مضمون "بنیاد پرستی یا تعمیرِ نو" میں فرماتے ہیں:

> "ہمارے دوست عبدالکریم عابد کا خیال ہے کہ بنیاد پرست تحریکوں کے پیچھے امریکہ کی دل چسپی رہی ہے۔ امریکہ نے پہلے ان جذبات پرست تحریکوں کو کمیونزم اور روس کے خلاف استعمال کیا اور اب انہیں یورپ کے ملحقہ علاقوں میں عروج دے رہا ہے۔ تاکہ یورپ اور مسلم دنیا کے درمیان نظریاتی تضادات اور سیاسی اختلافات بڑھیں اور

اس طرح امریکہ یورپی منڈی کے ترقی کے امکانات کو چیک کرنا چاہتا ہے تاکہ یورپ کہیں امریکہ سے آگے نہ بڑھ جائے۔ میرے خیال میں یہ تحریک یورپ کی ترقی کو تو صرف چیک کرے گی لیکن انجام کار مسلم معاشرہ کو تباہ کر دے گی۔"

جس موضوع پر محترم عبدالکریم عابد صاحب نے اظہارِ خیال فرمایا ہے، محترم پرویز مرحوم اسے طلوعِ اسلام کے شمارہ نومبر ۸۴ء میں بالتفصیل بیان کر چکے ہیں۔ بہتر ہوگا، اگر پرویز مرحوم کا مضمون "فنڈامنٹلزم" دوبارہ شائع کر دیا جائے تاکہ قارئین کو صحیح طور پر معلوم ہو سکے کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، جو فنڈامنٹلزم پر اس قدر زور دے رہے ہیں اور علی الاعلان فرما رہے ہیں کہ پاکستان میں یا سیکولرزم قائم ہوگا یا فنڈامنٹلزم، تو اس کے معنی کیا ہیں اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے مقاصد کیا ہیں؟

التماس

ایسی بزموں اور حضرات سے جنھوں نے اپنے عزیز و اقارب کے نام پرچے جاری کروا رکھے ہیں، التماس ہے کہ وہ سال ۱۹۹۳ء کے لئے اپنی فہرستوں میں ردّ و بدل فرمانا چاہیں تو اس کی اطلاع ۳۱ دسمبر ۹۲ء سے پہلے فرما دیں۔ بصورتِ دیگر ان کے پیشگی کھاتوں سے پرچوں کی ترسیل حسبِ سابق جاری رہے گی۔

ناظم ادارہ

طلوعِ اسلام لاہور

لہ پرویز مرحوم کے اس دلچسپ مضمون کا آئندہ شمارے میں انتظار فرمائیے۔

ملک حنیف وجرانی

سُپر پاور "اللہ"

نوعِ انسانی کی تاریخ اور آسمانی کتب توریت، انجیل اور قرآن سے یہ شواہد ملتے ہیں کہ جب ظالم نے مظلوم پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی، تو ایک غیبی طاقت، کائناتی سُپر پاور "اللہ" نے مظلوموں، کمزوروں اور زیر دستوں کو بچا لیا۔ البتہ ظالم، زبردست اور بالادست اقوام و طبقات کی جڑ کاٹ دی گئی۔ قومِ لوط، عاد، ثمود، اصحابِ ایکہ، اصحاب حجر، اہلِ مدین اور دیگر اقوامِ عالم کے ہاں اس کائناتی دستور یا سنت اللہ کا دہرایا جانا ملتا ہے۔

وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ (۲۳/۱۷)

اور ہم اپنی پیدائش سے بے خبر نہیں ہیں۔

اللہ ایسی سُپر پاور ہے جو کائناتی اور انسانی معاشرے کے لئے دیئے گئے قوانین کے مطابق انسانی تہذیب کے عروج و زوال پر اس طرح قادر و غالب ہے کہ

"کوئی کام بے نتیجہ نہیں رہ سکتا۔ کائنات کا یہ سارا سلسلہ سرگرمِ عمل ہی اس لئے ہے کہ ہر عمل کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب ہو جائے۔" (۲۱/۱۶، ۴۵/۲۲)

اب ذرا اللہ کی قوت، عزت اور جاہ و جلال کا نقشہ نورانی بھی ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (۴/۱۳۹)

۲۔ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (۱۳/۳۱)

۳۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ وَ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً (۴۱/۱۵)

۴۔ بَلْ لِلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ (۱۳/۳۱)

۵۔ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ (۳/۱۵۴)

۶۔ وَ اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ (۱۱/۱۲۳)

۷۔ وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ (۶/۶۴)

تخلیق، تقدیر اور موت وحیات پر اُسی کا حکم چلتا ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۶/۵۷ ؛ ۱۲/۴۰)

زمین وآسمان میں قانون اور تقدیر کی وحدت پر اُسی وَاحِدُ اللہ کو مکمل اختیارات حاصل ہیں۔ هُوَ کا صیغہ اس کا بہترین عکاس ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (۶۴/۱۳ ؛ ۹/۱۲۹ ؛ ۴۷/۱۹)

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱۱۲/۱ ؛ ۵/۷۳ ؛ ۱۸/۲۶ ؛ ۱۳/۱۶)

اس خالق، مالک، حاکم، رب اور رازق نے انسانی تخلیق سے پہلے سورج، چاند، ستاروں، قدرتی، فضا، پانی، نباتات اور حیوانات کو پیدا کر دیا تھا اور انسان کو "نفخ روح" انا، انسانی ذات، خودی کے اختیار وارادہ کی دولت سے مالا مال کر کے کرۂ ارض پر آباد کر دیا اور اپنی طرف سے ہدایت بھی بھیجدی۔ تمام انبیائے کرام علیہم السلام اور تمام آسمانی کتب اس کی شہادت ہیں کہ انسان کو فکرِ انسانی کے ساتھ علم وحی کی ضرورت ہے

"اللہ سُپر پاور ہے اور اُس کی آخری کتاب "قرآن" سُپر بم لاء۔"

بندگانِ خدا کو فائدہ پہنچانے والا اللہ کو سب سے زیادہ عزیز ہے

(حدیثِ نبوی)

حسد سے بچو کیونکہ حسد نیکیوں کو زائل کر دیتا ہے جس طرح آگ ایندھن کو کھا جاتی ہے۔

(حدیثِ نبوی)

باب المراسلات

سوال، سورہ بقرہ کی آیت ۲۴

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ۝ (۲/۲۴)

اس کا ترجمہ ایسے کیا جاتا ہے۔

"دوزخ کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں"۔

وضاحت طلب بات ہے کہ انسان تو سمجھ میں آتے ہیں۔ وہ پتھر کونسے ہیں۔ جواب بذریعہ طلوعِ اسلام دیا جائے۔

(ایم۔ آر۔ راجہ کینیڈا)

جواب:۔ آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اس جہنم کا ایندھن الناس اور الحجارۃ ہوں گے۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے انسان اور پتھر۔ اور پتھروں سے مراد لی جاتی ہے وہ بُت جن کی لوگ پرستش کرتے ہیں۔ یہ مفہوم بالبداہت غلط ہے۔ کیونکہ آیت کے اگلے لفظ ہیں اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ (۲/۲۴) "یعنی وہ آگ جسے کفار کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ پتھر خواہ ناتراشیدہ ہو یا اُسے تراش کر کوئی مورتی بنا دی جائے نہ مومن ہوتا ہے نہ کافر۔ مومن اور کافر تو انسان ہی ہوتے ہیں، پتھر نہیں ہوتے۔ اس لئے جو آگ کفار کے لئے تیار کی گئی ہو اس میں پتھروں کے جھونک دینے کا کیا مطلب؟

الناس والحجارۃ

الناس کے عام معنی نوعِ انسانی ہیں لیکن جب یہ لفظ تقابلی طور پر آئے گا تو اس کے معنے عوام الناس ہوں گے یعنی عام لوگ۔ مثلاً قرآن کریم مذہبی پیشواؤں کے متعلق کہتا ہے کہ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۲/۴۴) "تمہاری کیفیت یہ ہے کہ تم لوگوں کو

تو یہ وعظ و نصیحت کرتے ہو کہ وہ نیک کام کریں اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔" حالانکہ تم کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہو۔ کیا تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے کہ الکتاب کے احکام، عوام اور مذہبی پیشواؤں، دونوں کے لئے یکساں طور پر واجب الاتباع ہوتے ہیں۔" دوسری جگہ ان مذہبی پیشواؤں کے متعلق ہے۔ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (۹/۳۴) " یہ، النّاس، یعنی اپنے پیچھے چلنے والے عوام کا مال باطل طریق سے کھا جاتے ہیں۔" ان مقامات میں، ظاہر ہے کہ النّاس سے مراد مذہبی پیشواؤں کا اتباع کرنے والے عوام ہیں۔ سورۂ نساء میں ہے۔ اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَ یَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ (۴/۳۷) " یہ وہ لوگ ہیں جو خود بھی بخل کا شیوہ اختیار کرتے ہیں اور النّاس کو بھی یہی حکم دیتے ہیں کہ وہ بھی ایسا ہی کریں" (نیز ۵۷/۲۴)۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہاں النّاس سے مراد عوام ہیں اور حکم دینے والے اربابِ اقتدار یا قوم کے لیڈر۔

ان (اور ان جیسے دیگر مقامات) سے واضح ہے کہ النّاس سے مراد عوام ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو مذہبی پیشواؤں قومی لیڈروں یا حکمرانوں کے پیچھے چلتے ہیں۔

اب آئیے لفظ حِجَارَۃ کی طرف۔ اس کا مادہ (ح۔ ج۔ ر) ہے جس کے بنیادی معنی ہیں روکنا، منع کرنا اور اس سے مراد ہوتی ہے عقل، جو انسان کو یہ بتاتی ہے کہ نہیں کس مقام پر رُک جانا چاہیئے[1]۔ (خود لفظِ عَقْلُ کے معنی بھی روکنے اور منع کرنے کے ہیں)۔ اس اعتبار سے حُجْرُ ایسے آدمی کو کہتے ہیں جو بہت ہوشیار اور چالاک ہو۔ قرآنِ کریم نے ایسے لوگوں کو " ذِیْ حِجْرٍ " (۸۹/۵) کہا ہے۔ یعنی اربابِ دانش و بینش۔ لیکن وہی اربابِ دانش و بینش جو بڑے چالاک اور ہوشیار ہوں۔ یہی لوگ ہیں جو مذہبی پیشوا، قومی لیڈر یا اربابِ اقتدار بن کر خدا کی طرف جانے والے راستوں میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بنابریں " وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَۃُ " کے معنی ہوں گے عوام اور ان کے لیڈر۔ قرآنِ کریم میں، جہنم میں عوام اور ان کے لیڈروں کے باہمی جھگڑوں کو تشبیہی انداز میں، بڑے عبرت آموز پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ سورۃ سبا کی آیات (۳۴/۳۱-۳۳) میں کہا گیا ہے[2]۔

" اگر تو اس منظر کو سامنے لاتے جب یہ لوگ، جنہوں نے ظلم کی راہ اختیار کی تھی، خدا کے حضور کھڑے ہوں گے اور اپنی غلط روی کا ایک دوسرے پر الزام دھر رہے ہوں گے۔
عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ اگر تم ہمیں گمراہ نہ کرتے تو ہم یقیناً قوانینِ خداوندی پر ایمان لے آتے۔

---

[1] پتھر کو حجر اس لئے کہتے ہیں کہ وہ رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔
[2] آیات کسی نسخۂ قرآنِ مجید میں دیکھ لیجئے۔

لیڈر کہیں گے، ہمیں کیوں مطعون کرتے ہو۔ جب سیدھا راستہ تمہارے سامنے آگیا تھا تو کیا ہم نے تمہیں روکا تھا کہ اس راستہ کو اختیار نہ کرنا۔ تم خود ہی جرائم کا ارتکاب کرنا چاہتے تھے۔ اب مفت میں الزام ہم پر دھرتے ہو۔

ان کے متبعین کہیں گے کہ تم دن رات اس قسم کی چالیں چلتے اور سازشوں کا جال بچھاتے تھے جس سے ہم سیدھے راستہ کی طرف آ ہی نہ سکیں۔ کیا اس کے بعد بھی تم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہو کہ تم نے ہمیں نہیں بہکایا تھا۔

لیکن ان کا یہ عذر قابلِ پذیرائی نہیں سمجھا جائے گا اور ان سب کو داخلِ جہنم کر دیا جائے گا۔

سورۃ الصّٰفّٰت میں ہے کہ جہنم میں جانے والے ایک دوسرے کو مطعون کریں گے۔ عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ تم یورشیں کر کے ہماری طرف آیا کرتے تھے اور اس طرح ہمیں غلط راستے پر ڈال دیتے تھے۔ وہ ان سے کہیں گے کہ ہمارا تم پر کیا اختیار و اقتدار تھا۔ تم خود ہی صحیح راستہ پر چلنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم غلط راستہ پر چل رہے تھے۔ لیکن ہم نے تمہیں اس راستہ پر چلنے کے لئے مجبور نہیں کیا تھا۔ تم خود ہی پیچھے چل پڑے تھے اب ہم اس عذاب میں برابر کے شریک ہیں (۳۳۔ ۲۷/ ۳۷)۔ [1]

سورۃ مومن میں ہے:

جہنّم میں متبعین اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ ہم تمہارے پیچھے چلا کرتے تھے اور تم ہمیں بڑے سبز باغ دکھایا کرتے تھے۔ اب ذرا اس عذاب سے ہمیں چھڑا دو۔ وہ ان سے کہیں گے کہ ہم خود اس عذاب میں مبتلا ہیں۔ اب تو ہم سب کو یہ عذاب بھگتنا پڑے گا۔ (۴۸۔ ۴۰/۴۷ نیز ۲/۱۶۶۔ ۱۶۷؛ ۱۰۲۔ ۲۶/۹۵) [1]

ان تصریحات سے بتانا یہ مقصود ہے کہ آیت (۲/۲۴) میں کہا یہ گیا ہے کہ اگر ان واضح دلائل کے باوجود ان صداقتوں کا انکار کئے جاؤ گے تو تم تباہی اور بربادی کے جہنّم میں جا گرو گے ــــ تم بھی اور تمہارے پیچھے چلنے والے بھی ــــ وہ تباہی جو غلط راستے پر چلنے کا فطری انجام ہوتی ہے۔

---

[1] آیات کسی نسخۂ قرآنِ مجید میں دیکھ لیجئے۔

حسین امیر فرہاد

عذابِ الٰہی

عذاب کے بنیادی معانی ہیں، دکھ، تکلیف اور ایسی اذیت، جو انسان کے آرام میں حائل ہو۔ نیز اس کے معنی رکاوٹ کے بھی ہوتے ہیں۔ قرآن کی رُو سے اس کا مفہوم ہوتا ہے، قوانینِ خداوندی کے ناخوشگوار یا ہلاکت آفریں نتائج۔ ان نتائج میں طبعی تکالیف بھی شامل ہوتی ہیں اور انسان کی ذات پر جو اثر مرتب ہوتا ہے وہ بھی چونکہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی سے انسانی ذات کی نشوونما رُک جاتی ہے۔ یعنی یہ چیز اس کے راستے میں رکاوٹ کا موجب بنتی ہے اس لئے اِسے بھی عذاب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں عذاب کے لفظ سے ذہن اُخروی زندگی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور عذاب سے ان تکالیف کا تصور سامنے آتا ہے جن میں مجرمین (یا مذہب کی اصطلاح میں گنہگار) وہاں مبتلا ہوں گے۔ لیکن قرآن کی رُو سے عذاب اُخروی دنیا تک ہی محدود نہیں۔ اس دنیا کی زندگی میں بھی جو تکالیف پیش آتی ہیں انہیں بھی عذاب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسانی اعمال کے نتائج اس دنیا میں بھی مرتب ہوتے ہیں اور اُخروی زندگی میں بھی۔ اس لئے عذاب اس دنیا میں بھی آتا ہے اور آخرت میں بھی۔

ان عذابوں سے بچنے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ہماری توجہ اقوامِ سابقہ کی اس دنیا میں تباہی کی طرف دلائی ہے۔ کہا۔ سیروفی الارض ۔ فرمایا۔

"ان سے کہو کہ دنیا میں چلو پھرو اور دیکھو کہ مکذبین (قوانینِ خداوندی کو جھٹلانے والوں) کا انجام کیا ہوا۔ (آلِ عمران ۳۶؛ سورۃ انعام ۱۱)۔ فرمایا۔ "وہ قومیں ان سے بھی زیادہ طاقت ور تھیں (سورۃ روم ۹)۔ قوم ثمود کے کاشانوں کو دیکھو (سورہ نمل ۵۲)"۔

سیروفی الارض اس لئے کہ اس سے آنکھیں کھل جاتی ہیں، کانوں کے ڈاٹ الگ ہو جاتے ہیں۔ دلوں کی مہریں ٹوٹ جاتی ہیں کیونکہ ماتھے کی آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں۔ دل کی آنکھیں اندھی ہوا کرتی ہیں۔ (سورۃ حج آیت ۴۶)۔

نہیں یہ افیون دی جارہی ہے کہ یہ سب کچھ اقوام سابقہ کے ساتھ ہوا' پیارے نبیؐ کی پیاری امت کے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ جو کچھ اقوامِ سابقہ کے ساتھ ہوا وہ ہر اس قوم کے ساتھ ہوگا جو خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کرے گی۔ ذرا گریبان میں جھانکیئے۔ ہم نے خلاف ورزی کے علاوہ کیا ہی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کتاب اللہ پر فیصلے کرنے کو کہا ہے۔ فرمایا" جو لوگ قرآن کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ کافر ہیں" ـــــ سورۂ مائدہ آیت ۴۴)۔

ہم نے آج تک اس کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کی۔ بلکہ اس کو پڑھنے پڑھانے تک محدود رکھا' لہذا ہم سے بڑا کافر کون ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جائز طریقے سے رزق کمانے کو کہا ہے' ناجائز طریقے سے منع کیا ہے (سورہ بقرہ آیت ۱۸۸)۔ ہم نے ناجائز طریقے کو ترجیح دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسروں کا حق کھانے سے منع کیا ہے' ہم پیٹ بھر کر کھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے شراب جوئے سے منع کیا ہے جس میں لاٹری وغیرہ بھی ہے۔ ہمارے ہاں ان چیزوں کو قانونی تحفظ حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جھوٹ مکر فریب سے دور رہنے کو کہا ہے (سورۂ حج ۳۰)۔ ہم ان باتوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ اللہ نے سچی گواہی دینے کو کہا ہے۔ ہمارے ہاں جھوٹے گواہ عدالت میں مل جاتے ہیں۔ اللہ نے ایک دوسرے کے ساتھ احسان کرنے کو کہا ہے۔ ہم جس پر احسان کرلیتے ہیں اسے غلام بنا لیتے ہیں۔ اللہ نے فواحش کے قریب جانے سے روکا ہے' ہم فواحش کی مجسم تصویر بنے پھرتے ہیں۔ اللہ نے سود سے منع کیا ہے' ہمارا سارا کاروبار ہی سود پر چل رہا ہے۔ البتہ ہم نے سود کا نام بدل دیا' مارک اپ رکھ دیا ہے۔ اللہ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے، ہمارے تاجر اور کارخانے دار ڈاکوؤں کو مات دے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے امانت میں خیانت سے روکا ہے' ہم خیانت کئے بغیر رہ نہیں سکتے۔ آقائے نامدارؐ نے فرمایا۔" جس بستی میں کوئی بھوکا رات گذار دے' اس بستی سے اللہ اپنا ذمہ اٹھا لیتا ہے۔" یہاں غریب بھوک کے ہاتھوں عزت بیچنے پر مجبور ہیں اور اسمبلی کے ممبران کی تنخواہوں پر اور سفر خرچ پر سالانہ چھ کروڑ باون لاکھ تیس ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں۔ ان میں سپیکروں اور ڈپٹی سپیکروں کی تنخواہ شامل نہیں۔ گذشتہ سال ۱۷ دن کام کیا' ۱۳ بل پاس کئے۔ یہ ہے سچے' نڈر' بے باک، نہ جھکنے والوں' نہ بکنے والوں کا خرچہ جو یہ غریب عوام برداشت کر رہے ہیں' تو عذابِ الٰہی نے تو آنا تھا۔ یہ عذابِ الٰہی نہیں تو اور کیا ہے۔ سیلاب سے تین ہزار سے زیادہ دیہات متاثر ہوتے ہیں۔ جہاں پہلے انسان تھے' مویشی تھے' گاؤں تھے۔ اب وہاں تاحدِ نظر پانی ہی پانی نظر آرہا ہے۔ فصلیں تباہ' مکان نابود۔ یہ عذابِ الٰہی نہیں تو اور کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔" دنیا میں قوموں کی تباہی (عذاب) کی مختلف شکلیں ہیں" (سورۂ انعام آیت ۶۵)۔ ہم مومن نہیں' ورنہ فرمایا۔" مومنین کی زندگی خوشگوار ہوگی" (سورۂ نحل آیت ۹۷)۔ مگر مومنین تو وہ ہوتے ہیں جو کتاب اللہ پر اپنی حکومت قائم کرتے ہیں، جو ایسا

نہیں کرتے وہ کافر ہیں، تو ہم تو کافر ہیں اس لئے عذابِ الٰہی نے ہمیں گھیر لیا۔ فرمایا۔ "دنیا میں عذاب اوپر سے نیچے سے یا ہی لڑائیوں کا عذاب" (انعام آیت ۶۵)۔ جنگ کی شکل میں عذاب (انفال ۱۴)۔ بری تدابیر کرنے والوں کا انہی پر پڑتا ہے (سورۂ فاطر آیت ۴۳)۔ یہ ہمارے راہنماؤں کی بری تدابیر ہیں جن کا وبال ہم پر پڑ رہا ہے۔ سامانِ رزق کا تلف ہو جانا عذاب ہے (سورۂ قلم آیت ۳۳)۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ جب یہ عذاب آتا ہے تو سب کو لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ فرمایا۔ "ایسی تباہی جو ظالمین تک محدود نہیں رہتی" (سورۂ انفال آیت ۲۵)۔

بہرحال یہ بھی قدرت کی طرف سے ایک وارننگ ہے، مہلت ہے، ہمیں چاہیئے کہ ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے اعمال پر نظر ڈالیں ورنہ اس سے بھی زیادہ ہو سکتا ہے کیونکہ ہمارے معاشرے میں سے خوفِ خدا بالکل مٹ گیا ہے۔ اللہ کا فرمان ہے:

"عذاب آئے گا تو کہیں گے کہ ہمیں تھوڑی سی مہلت مل جائے تو ہم اچھے کام کر کے دکھائیں۔" (سورۂ ابراہیم آیت ۴۴)

لیکن پھر مہلت کہاں ملتی ہے۔ ہمیں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ ہمارے ہی متعلق یہ فرمانِ خداوندی ہے کہ یہاں کا اندھا وہاں بھی اندھا ہوگا۔ (سورہ بنی اسرائیل آیت ۷۲)

اے بادِ صبا! کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

PLEASE DO REMEMBER TO DONATE
LIBERALLY
FOR
GIFT SCHEME
AND RENEW YOUR SUBSCRIPTIONS
WELL IN TIME
PLEASE ALSO LET US KNOW
IF DESPATCH OF MAGAZINE
ORDERED BY YOU FOR THE YEAR 1992
IS TO BE CONTINUED OR NOT ?

جوہرِ نایاب

انسان کی اصل فضیلت اور برتری اس کے لئے اخلاق میں ہے۔ افراد ہوں یا اقوام، اخلاق کے زوال میں ان کا زوال اور اخلاق کی پابندی و استواری میں ان کی عظمت و رفعت ہے۔

اخلاق سے صرف یہ مراد نہیں کہ آدمی دوسروں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے خاطر و مدارات کرے، وقت پر کسی حاجتمند کی حاجت روائی کرے، زبان و قلم سے ہمدردی کا اظہار کرے، یا جیسا کہ اکثر تعریف کے طور پر کہا جاتا ہے۔ "مرنجاں مرنج" ہو۔

اخلاق کے حدود اس سے بہت آگے ہیں۔ عزم و استقلال، ضبط و تحمل، جرأت، کام کی لگن، فرض شناسی، دیانت، امانت، صداقت، رواداری، انصاف، ہمدردی، غم خواری اور ایثار و قربانی انسان کے اصل جوہر ہیں۔ ان سب میں ایثار کا درجہ سب سے اعلیٰ ترین ہے۔ یعنی ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دے۔ اپنے بھائیوں کا دُکھ درد سمجھے۔ انتہا یہ کہ اپنے آپ کو بھول جائے۔ انسانیت اسی سے عبارت ہے۔

بابائے اُردو

طلوعِ اسلام لاہور

علامہ غلام احمد پرویز

کا درسِ قرآن کریم مندرجہ ذیل مقامات پر ہوتا ہے

طلوعِ اسلام لاہور

شہر	مقام	دن	وقت
۱۔ ایبٹ آباد	۵۹۵۔ کے۔ ایل کیہال۔ رابطہ شیخ صلاح الدین	جمعۃ المبارک	۱۰۔ بجے صبح
۲۔ بورے والا	برمکان محمد اسلم صابر۔ مرضی پورہ گلی نمبر ۵	ہر ماہ پہلا، تیسرا جمعہ	۹۔ بجے صبح
۳۔ پشاور	برمکان محترم عبدالرزاق نزد چوک شہیداں قصہ خوانی بازار	بدھ / جمعہ	۴۔ بجے شام
۴۔ پشاور	برمکان ابن امین فقیر آباد	جمعۃ المبارک	۴۔ بجے شام
۵۔ پیر محل	مکان نمبر ۱۳۹/۱۴۰، مدینہ پارک	ہر ماہ پہلا جمعہ	۹۔ بجے صبح
۶۔ پنج کسی	برمطب حکیم احمد دین	جمعۃ المبارک	۳۔ بجے سہ پہر
۷۔ جہلم	برمکان محترم قمر پرویز مجاہد آباد، جی۔ ٹی روڈ	جمعۃ المبارک	۶۔ بجے شام
۸۔ جلالپور جٹاں	یونائیٹڈ مسلم ہسپتال	جمعرات	۱۰۔ بجے صبح
۹۔ چنیوٹ	ڈیرہ میاں احسان الٰہی کونسلر بلدیہ پیر بھٹہ بازار	جمعۃ المبارک	۳۔ بجے بعد نمازِ جمعہ
۱۰۔ چک ۲۱۵۔ ای۔ بی	برمکان چوہدری عبدالحمید	″	۸۔ بجے صبح
۱۱۔ حیدرآباد	گولڈن سینٹری، عثمان آباد	″	۱۰۔ بجے صبح
۱۲۔ رجانہ	برمکان چوہدری ایس۔ ایم صادق، مین بازار	ہر ماہ تیسرا جمعہ	۱۰۔ بجے صبح
۱۳۔ سرگودھا	۶۰۔ اے سول لائنز، ریلوے روڈ	جمعۃ المبارک	۹۔ بجے صبح
		″	
۱۵۔ فیصل آباد	۲۳۔ سی پیپلز کالونی (نزد تیزاب مل) رابطہ: ڈاکٹر محمد حیات ملک۔ فون ۴۲۸۵۵	″	۳۔ بجے سہ پہر
۱۶۔ فیصل آباد	ڈاکٹر طارق عزیز فاؤنڈیشن 5/B ۸۳ سول کوارٹرز غلام محمد آباد رابطہ فون ۳۳۰۷۰ / ۶۸۸۳۵	″	۳:۳۰ بجے شام

شہر	مقام	دن	وقت
۱۷۔ کوئٹہ	۱۶۶/ڈی، جائنٹ روڈ	جمعۃ المبارک	۵۔ بجے شام
۱۸۔ کراچی	سنووائٹ کمرشل کمپلیکس (فرسٹ فلور) شاہراہِ فیصل (نزد بلوچ کالونی سگنل)۔ فون: ۵۷۲۲۵۱ — ۵۴۷۳۲۹	//	۹:۳۰ بجے صبح
۱۹۔ کراچی	مکان ۱۲۰۶، گلی ۱۰، اے، بی ۳۶ شریف کالونی لانڈھی	اتوار	۸۔ بجے شب
۲۰۔ کوہاٹ	برمکان شیر محمد، نزد جناح لائبریری	جمعۃ المبارک	۸۔ بجے صبح
۲۱۔ گوجرانوالہ	شوکت نرسری گل روڈ، سول لائنز	//	بعد از نماز جمعہ
۲۲۔ گجرات	مرزا ہسپتال، کچہری روڈ	جمعرات	۴۔ بجے
۲۳۔ لاہور	۲۵۔ بی گلبرگ ۲ (نزد مین مارکیٹ)	جمعۃ المبارک	۹ بجے صبح
۲۴۔ لیہ	رحمانیہ میڈیکل سنٹر	//	بعد نمازِ مغرب
۲۵۔ ملتان	شاہ سنز، بیرون پاک گیٹ	//	۱۰۔ بجے صبح
۲۶۔ جوہر آباد	برمکان حکیم فاروق شاہ، قاضی کالونی	//	بعد نمازِ جمعہ
۲۷۔ ماموں کانجن	برمکان ڈاکٹر (ہومیو) محمد اقبال عامر چک ۵۰۹ گ ب	//	بعد نمازِ جمعہ
۲۸۔ ڈی جی خان	مدینہ ٹائپنگ کالج، بلاک ۲، کچہری روڈ	//	۳۔ بجے سہ پہر
۲۹۔ راولپنڈی	برمکان ملک فضل کریم ۳۰۔ ملت کالونی مکھا سنگھ سٹیٹ رابطہ: چوہدری نثار احمد، ہائی وے آٹو گوال منڈی ۷۴۷۵۲	//	۵۔ بجے شام

اوقاتِ درس کے دوران

مجلہ طلوعِ اسلام کا تازہ شمارہ اور مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ کی جملہ تصانیف بھی مندرجہ بالا مقامات سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

DARS-E-QURAN

(Recorded Lectures of Allama Ghulam Ahmed Parwez (r)

NO RESERVATION REQUIRED

ALL THOSE INTERESTED IN THE TEACHINGS OF QURAN ARE CORDIALLY INVITED.

1.	**BIRMINGHAM** 229 Alum Rock Road	Sunday 3 PM
2.	**CANADA** 716 The West Mall, Etobicock, ONT Phone (416)245-5322 or(416)620-4471	1st Sunday 11 AM
3.	**DENMARK** R.O.Aegte Taepper, Falkoner Aue 79 2000 Fredriksberg C.	Last Sat **2 PM**
4.	**KUWAIT** Residence Ubaid-Ur-Rahman Arain Phone 5316273	Friday 5PM
5.	**LONDON** 76 Park Road Ilford Essex Phone 0 1-553-1896	1st Sunday 2.30 PM
6.	NORWAY Akeberg Veien-56 -Oslo-6 Galgeberg, 4th floor	1st Sunday 4PM
7.	**YARDLEY** 633 Church Road, Yardley, Birmingham B33 8HA (Phone 021-628-3718)	Last Sun 2PM.

TOLU-E-ISLAM MAGAZINE AND PUBLICATIONS OF ALLAMA GHULAM AHMED PARWEZ(r) ARE ALSO AVAILABLE AT THE ABOVE PLACES

بچوں کا صفحہ

اسلامی معاشرت
علامہ غلام احمد پرویزؒ

کھانا پینا

۴

حرام چیزیں قرآنِ کریم نے چار چیزوں کے متعلق کہا ہے کہ ان کا کھانا حرام ہے۔

حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ (۲/۱۷۳)

"تم پر حرام کیا جاتا ہے (۱) مُردار، (۲) بہتا ہوا لہو، (۳) سؤر کا گوشت اور (۴) ہر وہ شے جسے اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کیا جائے۔"

لیکن اگر ایسی مجبوری کی حالت ہو جائے کہ کچھ اور کھانے کو نہ ملے تو اس صورت میں حرام چیزوں کو بھی بقدر ضرورت کھایا جا سکتا ہے۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ (۲/۱۷۳)

"لیکن بحالتِ مجبوری ان چیزوں کو کھا سکتے ہو۔ بشرطیکہ یہ کھانا قانون شکنی اور خدا کے حکموں سے سرکشی کرنے کی غرض سے نہ ہو۔"

خوشگوار چیزیں ان چیزوں کے علاوہ کھانے پینے کی اور کوئی چیز حرام نہیں۔ لیکن حلال چیزوں میں سے وہی کھانی چاہئیں جو خوشگوار ہوں۔ یعنی وہ چیزیں جو طبیعت کو اچھی لگیں اور صحت کے لئے مفید ہوں۔

كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ز (۲/۱۶۸)

"زمین میں جو کچھ حلال اور خوشگوار ہے اسے کھاؤ۔"

حلال کو حرام مت قرار دو جس حلال چیز کے کھانے کو جی نہ چاہے اسے مت کھاؤ، لیکن اسے حرام مت قرار دو۔ یہ کہو کہ مجھے وہ پسند نہیں۔ سورۂ مائدہ میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ

لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا۔ (۵/۸۷)

"جو خوشگوار چیزیں خدا نے تمہارے لئے حلال قرار دی ہیں، انہیں حرام مت قرار دو۔"

اسراف حلال اور خوشگوار کو بھی اعتدال کے ساتھ کھاؤ۔ ضرورت سے زیادہ مت کھاؤ۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ج (۷/۳۱)

"کھاؤ پیو لیکن اسراف مت کرو۔"

تبذیر یعنی ضرورت سے زیادہ نہ کھاؤ۔ نہ ہی بلا ضرورت۔

لَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ (۱۷/۲۶)

"تبذیر مت کرو۔"

کیسے کھانا چاہیئے خواہ مل کر کھاؤ۔ خواہ الگ الگ کھاؤ۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا (۲۴/۶۱)

"اس میں کچھ حرج نہیں کہ تم اکٹھے کھاؤ یا الگ الگ۔"

(نوٹ)

دسترخوان پر بیٹھ کر کھاؤ یا میز کرسی پر۔ ہاتھ سے کھاؤ یا چھری کانٹے سے۔ جس طرح سہولت ہو کھاؤ پیو۔ ان میں کوئی ہرج کی بات نہیں۔